أَفْضَلُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ

"تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن حکیم سیکھے اور سکھائے" (صحیح بخاری)

جید قراء کرام کی آواز میں تلاوتِ قُرآن
مستند اُردو ترجمہ کے ساتھ تفہیمِ قُرآن



ماہِ رمضان کی بابرکت ساعتوں میں اپنی ساعتوں کو تلاوتِ کلامِ مجید سے بہرہ ور کرنے کیلئے ریڈیو پاکستان کے

ایف ایم چینل **93.4** **"صوتُ القرآن"** کو ٹیون کریں یا اپنے موبائل فون پر ریڈیو ایپ **ریڈیو پاکستان آفیشل** ڈاؤن لوڈ

کرنے کے بعد لائیو سٹریم کے ذریعے اس چینل کی نشریات سُنیں

الحمدللہ!

ملک کے ساٹھ شہروں اسلام آباد، لاہور، کوئٹہ، ملتان، فیصل آباد، ناروال، بہاولپور، حیدر آباد، خیرپور، مٹھی، گلگت، سکردو، بنوں، ڈیرہ اسماعیل خان، گوادر، سبی، میرپور، پشاور، کراچی اور دیگر شہروں میں

کی یہ نشریات سے جاری ہیں

"صوتُ القرآن" **2015**

ان شاء اللہ

ریڈیو پاکستان، وزارتِ اطلاعات و نشریات
حکومتِ پاکستان

ماہنامہ

آہنگ

۱۹۴۸ء سے مسلسل اشاعت

اکتوبر 2026ء

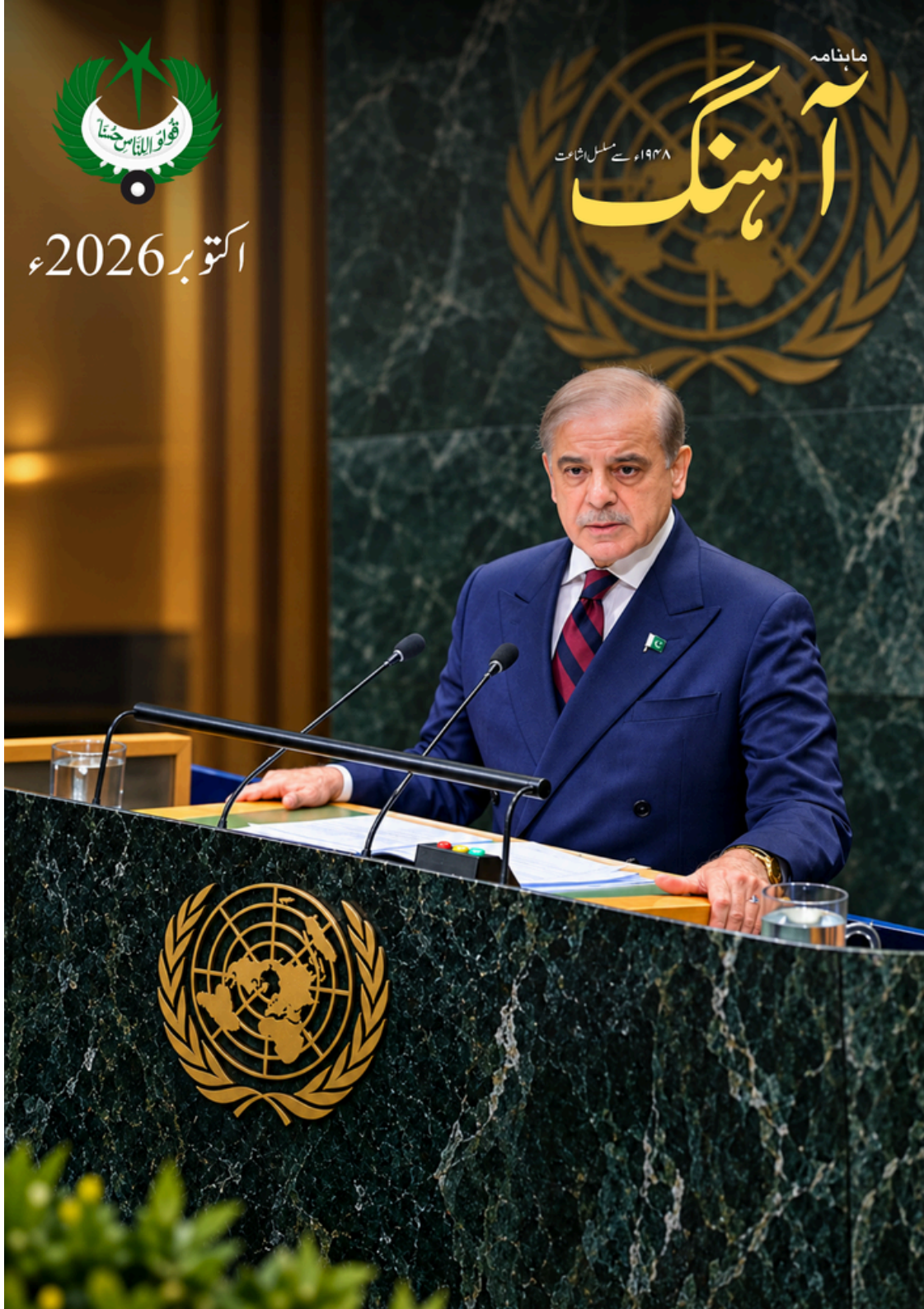

اداریہ

اکتوبر کا مہینہ قومی تاریخ کے ایسے اہم واقعات کی یاد دلاتا ہے جو ہمیں اپنے قومی مؤقف، اجتماعی ذمہ داریوں اور مستقبل کے تقاضوں پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے 81 ویں اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے وزیرِاعظم جناب محمد شہباز شریف نے مسئلۂ کشمیر و فلسطین، عالمی امن اور اقوام کے حقِ خودارادیت پر پاکستان کا مؤقف پیش کیا۔ یہ مؤقف نہ صرف مظلوم اقوام کے حقوق کی حمایت کا اظہار ہے بلکہ عالمی برادری کو انصاف، انسانی وقار اور پائیدار امن کے قیام کی ذمہ داری بھی یاد دلاتا ہے۔ اِنہی اصولوں کی روشنی میں 27 اکتوبر کا یومِ سیاہ مسئلۂ کشمیر کی سنگینی اور کشمیری عوام کی جدوجہدِ آزادی کی یاد تازہ کرتا ہے۔ یہ دن ہمیں یاد دلاتا ہے کہ امن کا قیام اُسی وقت ممکن ہے جب قوموں کے بنیادی حقوق اور اُن کی اُمنگوں کا احترام کیا جائے۔ کشمیری عوام کی قربانیاں اور حقِ خودارادیت کے لیے اُن کی جدوجہد عالمی ضمیر سے مسلسل یہ تقاضا کرتی ہیں کہ مسئلے کا منصفانہ حل اقوامِ متحدہ کی متعلقہ قراردادوں کے مطابق تلاش کیا جائے۔ پاکستان کشمیری عوام کی سیاسی، اخلاقی اور سفارتی حمایت جاری رکھنے کے عزم پر قائم ہے۔

حقوق، انسانی ہمدردی اور اجتماعی ذمہ داری کا یہی احساس ہمیں 8 اکتوبر 2005ء کے تباہ کن زلزلے کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے، جب قدرتی آفت نے ہزاروں جانیں لے لیں اور بے شمار خاندانوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ اِس سانحے کے بعد قوم نے جس جذبۂ ایثار، اتحاد اور خدمت کا مظاہرہ کیا، وہ اِس حقیقت کا ثبوت ہے کہ مشکل کی گھڑی میں باہمی تعاون ہماری سب سے بڑی قوت بن سکتا ہے۔ یہ تلخ تجربہ ہمیں قدرتی آفات سے نمٹنے کے لیے پیشگی تیاری، مؤثر منصوبہ بندی اور عوامی آگاہی کی اہمیت بھی سمجھاتا ہے۔ متاثرین کی یاد کو زندہ رکھنے کا تقاضا ہے کہ ہم ایک محفوظ، مستعد اور ذمہ دار معاشرے کی تشکیل کے لیے مسلسل کوشش کریں۔ ماہِ اکتوبر کے یہ واقعات ہمیں ایک مشترکہ پیغام دیتے ہیں: قومی وقار کا تحفظ، مظلوموں کے حقوق کی حمایت اور مشکلات کا مقابلہ اتحاد، شعور اور عزم سے ہی ممکن ہے۔ ضرورت اِس امر کی ہے کہ ہم ماضی کے تجربات سے رہنمائی لیتے ہوئے حال کی ذمہ داریاں نبھائیں اور آنے والی نسلوں کے لیے ایک پُرامن، مضبوط اور خوش حال پاکستان کی بنیاد مستحکم کریں۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے وطن کو امن و استحکام عطا فرمائے اور ہمیں اُمید، اتحاد اور خلوص کے ساتھ روشن مستقبل کی تعمیر کی توفیق دے۔

(آمین)

سرپرستِ اعلیٰ
اشفاق احمد خلیل

نگرانِ اعلیٰ
سعید احمد شیخ

نگران
عمران جاوید

مدیرِ اعلیٰ
افشاں نگار

مدیر
انیس الرحمن

کمپوزنگ
رابعہ شبیر احمد

گرافک ڈیزائننگ
عمران جوہر

قیمت: 500 روپے

ماہنامہ آہنگ اکتوبر 2026ء

☆عزمِ نو۔۔۔

وزیرِاعظم جناب محمد شہباز شریف کا نیویارک میں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے 81 ویں اجلاس میں خطاب پر مبنی رپورٹ — رپورٹ: غضنفر عزیز — 3

ریڈیو پاکستان پشاور، نو بحال شدہ عمارت کا افتتاح — رپورٹ: عبدالمجید بلوچ — 4

سینیٹر جناب سرمد علی کا "ڈیجیٹل دور میں ریڈیو کا مستقبل" کے حوالے سے خصوصی انٹرویو — انٹرویور: صدف رانی (پروگرام مینیجر FM101) — 5

☆مضامین۔۔۔

قائدِ ملت شہید لیاقت علی خان، ایک جہاں دیدہ رہنما — تحریر: رانا غلام قادر — 7

27 اکتوبر: یومِ سیاہ اور ریڈیو کی گونجتی آواز — تحریر: خوشبخت شیریں — 8

پاکستانی سماج کی نشوونما میں حکیم محمد سعید کی تعلیمات اور کوششوں کا حصہ — تحریر: سعدیہ راشد — 10

راجہ صاحب آف محمود آباد — تحریر: خواجہ رضی حیدر — 12

☆سخن ور۔۔۔

ہمہ پہلو شاعر دل نواز اور ادیب، حضرت بہزاد لکھنوی — تحریر: محمد ظہیر بدر — 14

قمر جلالوی — تحریر: ڈاکٹر ذیشان تبسم — 15

☆دانش ور۔۔۔

اُستاد قمر جلالوی، سائیکل سے جُڑی کراچی کی دو حقیقی کہانیوں میں سے ایک کا لازوال کردار — تحریر: محمد سعید احمد شیخ — 16

☆اُردو ادب۔۔۔

جنت آباد (افسانہ) — تحریر: ڈاکٹر عبدالمالک بلوچ — 19

اُردو انشائیہ۔ فن، فکر اور اسلوب کی دل نشین دنیا — تحریر: سید عابس رضا کاظمی — 21

کیا زمانہ تھا (انشائیہ) — تحریر: ڈاکٹر صلاح الدین حیدر — 24

نقل سے نقلِ مکانی تک (فکاہیہ کالم) — تحریر: پروفیسر ہمایوں — 25

میرا کتھارسس — تحریر: عابد کاظمی — 26

☆سائنس اور ٹیکنالوجی۔۔۔

ایشیا ڈیسیفک میڈیا فورم ریڈیو پاکستان کے لیے ایک نیا باب — تحریر: ذیشان حیدر — 28

☆ہم تو آواز ہیں۔۔۔

ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان جناب سعید احمد شیخ کا دورہ آزاد کشمیر ریڈیو میرپور — رپورٹ: علی اختر سلیم — 29

ریڈیو بہاولپور میں طلباء کے درمیان نغماتِ قائد کا مقابلہ — رپورٹ: فیض رسول ہاشمی — 32

میں ہوں کشمیر کی آواز، ریڈیو آزاد کشمیر مظفر آباد کی سالگرہ — تحریر: خالد محمود — 33

اگر ہے جذبہ تعمیر زندہ — تحریر: خالد محمود — 34

آزاد کشمیر ریڈیو میرپور کی 24 ویں اور FM101 میرپور کی 17 ویں سالگرہ کی پُروقار تقریب — رپورٹ: علی اختر سلیم — 35

FM101 ملتان کی 16 ویں سالگرہ — رپورٹ: عرفان ملک — 36

سفر کہانی، ریڈیو پاکستان لاڑکانہ کی 31 ویں سالگرہ — تحریر: وسند علی مہر — 37

FM101 اسلام آباد کے 28 برس، نشریات، معلومات اور قومی ہم آہنگی کا روشن سفر — رپورٹ: ناصر علی خان — 38

☆فن اور فنکار۔۔۔

سُروں میں روح پھونکنے والی سنگیت کارہ، عابدہ پروین — تحریر: ڈاکٹر احسان دانش — 39

☆بچوں کا آہنگ۔۔۔

بچوں کا ادب — تحریر: احسان علی دانش — 40



وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف کا نیو یارک میں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے 81 ویں اجلاس میں خطاب پر مبنی رپورٹ

رپورٹ: غضنفر عزیز

وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف نے نیویارک میں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اکاسویں اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ حرمین شریفین کی حُرمت اور سلامتی ایسی سُرخ لکیر ہے جسے کبھی عبور نہیں کیا جانا چاہیے۔ وزیراعظم نے کہا کہ مکہ مکرمہ پر ڈرون حملے کی کوشش سے دنیا بھر کے مسلمان شدید غم و غصے میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اُنہوں نے سعودی عرب پر حوثیوں کے حالیہ افسوسناک حملوں کی شدید مذمت کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان سعودی عرب کے برادر عوام کے ساتھ مکمل یکجہتی کا اظہار کرتا ہے۔ اُنہوں نے اِس بات پر بھی زور دیا کہ آبنائے ہرمز اور باب المندب عالمی معیشت کے مراکز ہیں جنہیں کھلا رہنا چاہیے۔

سعودی عرب، ترکیہ اور پاکستان کے درمیان تاریخی مکہ مشترکہ دفاعی معاہدے کے حوالے سے وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف نے کہا کہ یہ کسی ملک کے خلاف نہیں بلکہ خطے میں دفاع، استحکام اور امن کے لیے ہماری مشترکہ ذمہ داری ہے۔ اُنہوں نے خطے میں استحکام کے لیے اسلام آباد مفاہمتی یادداشت پر دستخط میں سہولت کاری سمیت پاکستان کی امن کی کوششوں کو بھی اُجاگر کیا اور کہا کہ مشترکہ کوششوں کے ذریعے پاکستان نے امریکہ اور ایران کو اسلام آباد میں ایک ہی چھت تلے کامیابی سے اکٹھا کیا۔ اُنہوں نے اِس سلسلے میں چیف آف ڈیفنس فورسز اور بَری فوج کے سربراہ فیلڈ مارشل جناب سید عاصم منیر اور نائب وزیراعظم جناب اسحاق ڈار کی امن کے لیے مسلسل کوششوں کو سراہا۔

جنوبی ایشیا کا ذکر کرتے ہوئے اُنہوں نے کہا کہ گزشتہ سال پاکستان کو بھارت کی جانب سے بلا اشتعال جارحیت کا سامنا کرنا پڑا تاہم پاکستان نے اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے آرٹیکل 51 کے تحت اپنے فطری حقِ دفاع کا استعمال کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ فیلڈ مارشل جناب سید عاصم منیر کی جرأت مندانہ قیادت میں پاکستان کی بہادر مسلح افواج نے استقامت اور پیشہ ورانہ مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے دشمن کو خاموش کرایا، اُس کے حملے کو پسپا کیا اور اُسے ایسا سبق سکھایا جسے وہ کبھی فراموش نہیں کرے گا۔

اُنہوں نے کہا کہ امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے بروقت مداخلت کر کے دو جوہری طاقتوں کے حامل ہمسایہ ممالک کے درمیان بڑی جنگ روکی اور اِس بات پر زور دیا کہ جنوبی ایشیا کو دوبارہ کبھی اِس مقام تک نہیں پہنچنا چاہیے جس کے لیے مسئلۂ کشمیر کا منصفانہ حل ضروری ہے۔ وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف نے کہا کہ آٹھ دہائیوں سے کشمیری عوام اقوامِ متحدہ کی زیرِ نگرانی آزاد اور غیر جانبدارانہ استصوابِ رائے کے اپنے سنجیدہ وعدے کی تکمیل کے منتظر ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ کشمیریوں کی آبادی کے تناسب میں مصنوعی تبدیلی اور دیگر غیر قانونی اقدامات کے ذریعے متوضعہ جموں و کشمیر کی قانونی حیثیت تبدیل کرنے کی بھی کوششیں کی گئی ہیں۔ اُنہوں نے واضح کیا کہ کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

سندھ طاس معاہدے کے بارے میں وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف نے کہا کہ موجودہ معاہدے کو یکطرفہ طور پر معطل کرنے کا بھارتی فیصلہ کسی بھی قانونی بنیاد سے محروم ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ پاکستان کا مؤقف ہے کہ یہ معاہدہ دستور مؤثر، قابلِ عمل اور ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا تر ہے۔ جناب محمد شہباز شریف نے زور دیا کہ پانی کو ہتھیار کے طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اُنہوں نے واضح کیا کہ پاکستان کے حصے کے پانی کو روکنے، اِس میں رکاوٹ ڈالنے اور اِس کا رخ موڑنے کی کوئی بھی کوشش جنگی اقدام تصور کی جائے گی۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ کا ذکر کرتے ہوئے وزیراعظم نے کہا کہ پاکستان نے اِس جنگ میں تقریباً ایک لاکھ قیمتی جانوں کی قربانی دی اور 150 ارب ڈالر سے زائد کے معاشی نقصانات برداشت کیے۔ اُنہوں نے کہا کہ ٹی ٹی پی، فتنہ الخوارج، بی ایل اے اور فتنہ الہندوستان، افغان سرزمین پاکستان کے خلاف استعمال کر رہے ہیں جن کا مقصد پاکستان کو غیر مستحکم کرنا ہے۔ وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف نے مطالبہ کیا کہ افغانستان کی سرزمین سے دراندازی سمیت ایسے تمام حملے فوری طور پر مکمل طور پر بند کیے جائیں۔ اُنہوں نے کہا کہ افغان حکام کو اپنی بین الاقوامی ذمہ داری پوری کرتے ہوئے قابلِ تصدیق اور فیصلہ کن اقدامات کرنا ہوں گے تاکہ آئندہ افغان سرزمین کو پاکستان یا کسی بھی دوسرے ملک کے خلاف استعمال نہ کیا جا سکے۔

بشکریہ نیوز اینڈ کرنٹ افیئرز چینل





ریڈیو پاکستان پشاور - نو بحال شُدہ عمارت کا افتتاح

رپورٹ: عبدالمجید بلوچ

ریڈیو پاکستان پشاور کی عمارت کا 22 ستمبر 2026ء کو باضابطہ افتتاح کر دیا گیا۔ وفاقی وزیر برائے اطلاعات و نشریات جناب عطاءاللہ تارڑ نے تختی کی نقاب کشائی کر کے عمارت کا افتتاح کیا۔ یاد رہے کہ ریڈیو پاکستان پشاور کی عمارت کو 9 اور 10 مئی 2023 کو مشتعل مظاہرین نے نذرِ آتش کر دیا تھا جس سے عمارت کے جلنے کے ساتھ ساتھ سارا سرکاری ریکارڈ اور ریڈیو پاکستان کے آواز خزانے کو بھی نقصان پہنچا۔ اِس سانحہ کے بعد وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف نے ریڈیو پاکستان پشاور کا دورہ کیا تھا اور اِس عمارت کی بحالی کا وعدہ کیا اور چھ ماہ میں یہ عمارت وفاقی وزیر برائے اطلاعات و نشریات جناب عطاءاللہ تارڑ کی زیرِ نگرانی بحال کر دی گئی۔ اُنہوں نے براڈکاسٹنگ ہاؤس کے میوزیم یا خزانہ کے قیام کو سراہا۔ اِس موقع پر ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان جناب سعید احمد شیخ نے محترم وفاقی وزیر کے ساتھ گفتگو میں اُن کو بتایا کہ میوزیم یا خزانہ کا قیام پروجیکٹ میں شامل نہیں تھا تاہم یہ اپنی مدد آپ کے تحت قائم کیا گیا ہے اور یہ ریڈیو پاکستان پشاور برٹش انڈیا کا اِس خطے میں پہلا ریڈیو اسٹیشن ہے جس کا قیام 6 مارچ 1935ء کو عمل میں آیا اور 13 اور 14 اگست 1947ء کی درمیانی شب قیامِ پاکستان کا اعلان پشتو میں عبداللہ جان مغموم نے کیا جبکہ اُردو میں یہ اعلان آفتاب احمد نے کیا۔ اِس کے بعد احمد ندیم قاسمی کا لکھا ملی نغمہ "پاکستان بنانے والے پاکستان مبارک ہو" پشاور خان کی آواز میں براہِ راست نشر ہوا۔ مہمانِ خصوصی وفاقی وزیر برائے اطلاعات و نشریات جناب عطاء اللہ تارڑ نے اِس تاریخی حقیقت کو معلومات افزاء قرار دیتے ہوئے کہا کہ ریڈیو پاکستان سے قیامِ پاکستان کا اعلان بالعموم ریڈیو پاکستان لاہور سے منسوب ہے تاہم ریڈیو پاکستان پشاور سے بھی قیامِ پاکستان کا اعلان ہوا اور پھر یہ برٹش انڈیا کا خطے میں پہلا ریڈیو اسٹیشن ہے۔ اِس سے نہ صرف ریڈیو پاکستان پشاور کی اہمیت افادیت واضح ہوتی ہے بلکہ یہ امر اِس خطے کی تاریخی اہمیت کو بھی اُجاگر کرتا ہے۔ اِس کے بعد وفاقی وزیر محترم نے اسٹوڈیوز کا دورہ کیا۔ اُنہوں نے سوشل میڈیا اسٹوڈیو میں پروگرام گجرہ کے لگے سیٹ کو سراہا اور ایف ایم 101 کی جدت طرازی اور ڈیزائن کی تعریف بھی کی۔ اُنہوں نے آرچ کو اَن ائیر اپنے خصوصی تہنیتی پیغام میں سامعین کو براڈکاسٹنگ ہاؤس کی بحالی پر مُبارکباد دی اور ریڈیو پاکستان کو مزید فعال اور جدت کے خطوط پر استوار کرنے کے حوالے سے اپنے عزم کا اظہار کیا۔ اُنہوں نے پوڈکاسٹ اسٹوڈیو بھی دیکھا اور صوت القرآن چینل کے حوالے سے بھی بریفنگ لی۔ جناب عطاءتارڑ نے اسٹوڈیوز میں موجود تکنیکی سہولیات پر اطمینان کا اظہار کیا۔ بعد ازاں اُنہوں نے اِسی مناسبت سے ریڈیو پاکستان پشاور کے صاحبزادہ عبدالقیوم آڈیٹوریم میں منعقدہ تقریب سے خطاب بھی کیا۔ تقریب میں پاکستان مسلم لیگ (ن) کے ورکرز نے کثیر تعداد میں شرکت کی جبکہ مرکزی قائدین میں سابق گورنر خیبر پختونخوا جناب اقبال ظفر جھگڑا، وزیراعظم پاکستان کے مشیر برائے خیبر پختونخوا امور جناب اختیار ولی، ملک طارق اعوان، جلال خان، خادم علی خان یوسف زئی اور دیگر عمائدین شریک تھے۔ تقریب کا باقاعدہ آغاز تلاوتِ کلامِ پاک سے ہوا۔ اِس کے بعد ایس ایم ڈی اسکرین پر ریڈیو پاکستان پشاور کی مختصر تاریخ بشمول 9 مئی کے واقعات دکھائے گئے اور ریڈیو پاکستان پشاور کے 14 اگست اور نیان المرصوص کے حوالے سے تیار کردہ خصوصی نغمے بھی چلائے گئے۔ مہمانِ خصوصی وفاقی وزیر برائے اطلاعات و نشریات جناب عطاءاللہ تارڑ نے اپنے خطاب میں کہا کہ ہم نے ریڈیو پاکستان پشاور کی بلڈنگ کی بحالی کا کام چھ ماہ کی قلیل مدت میں مکمل کر کے اِس ادارے سے نہ صرف اپنی جذباتی وابستگی بلکہ یہاں کے عوام کے لئے اپنے خلوص و محبت کا اظہار کیا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ وفاقی حکومت وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف کی قیادت میں یہاں امن لائے گی، عوامی فلاح و بہبود ہمارا مشن ہے۔ تعمیر و ترقی یہاں کے غیور عوام کا حق ہے اور یہ حق ہم دیں گے انشاءاللہ۔ وفاقی وزیر برائے اطلاعات و نشریات عطاءاللہ تارڑ نے کہا کہ آج ریڈیو پاکستان پشاور کی بلڈنگ کے مکمل فعال و بحال ہونے سے یہ پیغام بڑا واضح ہے کہ وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف کا ویژن ملکی تعمیر و ترقی ہے اور وفاقی حکومت انشاءاللہ خیبر پختونخوا میں اپنے ترقیاتی کام جاری رکھے گی۔ اِس سے قبل ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان جناب سعید احمد شیخ نے خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے ریڈیو پاکستان پشاور کی تاریخی اہمیت و افادیت کے ساتھ ساتھ عہدِ حاضر میں اِس کی کارکردگی پر روشنی ڈالی۔

سینیٹر سرمد علی کا" ڈیجیٹل دور میں ریڈیو کا مستقبل" کے حوالے سے خصوصی انٹرویو

انٹرویور :صدف رانی ،پروگرام مینیجر FM101



صدف رانی: السلام علیکم، سر آپ کا شکریہ کہ آپ تشریف لائے۔

سینیٹر سرمد علی: آپ کا شکریہ صدف صاحبہ جو آپ نے مدعو کیا۔

س: معاشرے میں رائے سازی کے حوالے سے میڈیا کا کیا کردار ہے اور آج کے ڈیجیٹل دور میں اِس کی کیا اہمیت ہے؟

ج: میڈیا کو معاشرے میں رائے سازی کے حوالے سے اہم حیثیت حاصل ہے اور اِسے اکثر معاشرے کا ایک اہم ستون تصور کیا جاتا ہے۔ میڈیا صرف خبر پہنچانے کا ذریعہ نہیں بلکہ معاشرے کی سوچ اور معلومات کے نظام کا اہم حصہ بھی ہے۔ یہ نکتہ آج کے ڈیجیٹل دور میں مزید اہم ہو جاتا ہے، کیونکہ آج ہر شخص معلومات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ معلومات پیدا اور شیئر بھی کر سکتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں رابطے (Communication) اور ابلاغ کی اہمیت سامنے آتی ہے۔ ماضی میں معلومات ایک محدود راستے سے عوام تک پہنچتی تھیں۔ آج معلومات کے ذرائع بے شمار ہیں۔ لیکن ذرائع کی تعداد بڑھنے کے ساتھ ذمہ داری بھی بڑھ گئی ہے۔

س: آج کل کے ذرائع کے تیز ترین دور میں Fake نیوز اور آزادیٔ رائے کے دور میں ہماری ذمہ داریاں کیا ہو سکتی ہیں یا ہماری ذمہ داریاں کتنی بڑھ گئی ہیں؟

ج: آج کوئی بھی شخص کسی خبر یا معلومات کو فوراً اپنے یوٹیوب چینل یا کسی دوسرے ڈیجیٹل پلیٹ فارم پر ڈال سکتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اگر معلومات کی تصدیق نہ کی جائے تو وہ بہت تیزی سے لوگوں تک پہنچ سکتی ہیں۔ یہ صورتحال دنیا کے بڑے چیلنجز میں سے ایک ہے۔ فیک نیوز اور ڈس انفارمیشن کے پھیلاؤ کو روکنے میں مین اسٹریم میڈیا کا کردار اہم ہے، جس میں ٹیلی ویژن، اخبارات اور ریڈیو شامل ہیں۔ ڈیجیٹل میڈیا نے معلومات کو تیز کر دیا ہے، لیکن رفتار ہمیشہ درستگی کی ضمانت نہیں ہوتی۔ روایتی میڈیا کا ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ وہاں خبر کے انتخاب، ایڈیٹنگ اور تصدیق کے لیے ایک ادارہ جاتی نظام موجود ہوتا ہے۔ یہی نظام عوام تک زیادہ ذمہ دارانہ معلومات پہنچانے میں مدد دیتا ہے۔

س: سوشل میڈیا اور ڈیجیٹل دور میں آپ کیا سمجھتے ہیں کہ روایتی میڈیا کی اہمیت کم ہو رہی ہے۔ آپ کی رائے اِس حوالے سے کیا ہے؟

ج: دیکھیں! ماضی میں بھی بار بار یہ پیش گوئیاں کی جاتی رہی ہیں کہ اخبار ختم ہو جائے گا، ٹیلی ویژن ختم ہو جائے گا یا کوئی اور میڈیا پلیٹ فارم ختم ہو جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ہر میڈیا پلیٹ فارم کا اپنا کردار ہے۔ ایک شخص صبح اخبار پڑھ سکتا ہے، سفر کے دوران ریڈیو سُن سکتا ہے، دفتر میں ڈیجیٹل پلیٹ فارم استعمال کر سکتا ہے اور شام کو ٹیلی ویژن دیکھ سکتا ہے۔ یعنی ایک ذریعہ لازماً دوسرے ذریعے کو ختم نہیں کرتا۔ بلکہ جدید میڈیا صارف مختلف پلیٹ فارمز کو اپنی روزمرہ زندگی کے مختلف اوقات میں استعمال کرتا ہے۔

اِس کی وضاحت ایک دلچسپ مثال سے ہے کہ ایک ہی شخص صبح اخبار پڑھنے کے بعد گھر سے نکلتے ہوئے FM 101 سُن سکتا ہے، دفتر پہنچ کر آن لائن مواد دیکھ سکتا ہے اور بعد میں دوسرے پلیٹ فارمز استعمال کر سکتا ہے۔ یہ مثال دراصل جدید میڈیا کی حقیقت کو بہت سادہ انداز میں بیان کرتی ہے: میڈیا ختم نہیں ہوتا، میڈیا استعمال کرنے کا انداز تبدیل ہوتا ہے۔

س: آپ کی نظر میں ریڈیو میڈیا کا کیا مستقبل ہے اور آج ریڈیو کہاں کھڑا ہے؟ اور ریڈیو کا نیا روپ کیا ہو سکتا ہے؟

ج: سب کی بھی میڈیا پلیٹ فارم کے بارے میں یہ کہنا درست نہیں کہ وہ مکمل طور پر ختم ہو گیا ہے۔ ہر پلیٹ فارم کا اپنا کردار ہے۔ ہو سکتا ہے کسی میڈیا کی مجموعی اہمیت یا استعمال کا تناسب وقت کے ساتھ تبدیل ہو، لیکن وہ میڈیا کے مکمل طور پر ختم ہونے کا مطلب نہیں۔ ریڈیو کی طاقت صرف اِس کے ماضی میں نہیں بلکہ اِس کے بدلنے کی صلاحیت میں بھی ہے۔ آج روایتی ٹرانزسٹر کی جگہ موبائل فون نے بڑی حد تک لے لی ہے۔ اب سامع اپنے موبائل فون پر ریڈیو سُن سکتا ہے۔ ڈیجیٹل ریڈیو، موبائل ایپس اور آن لائن اسٹریمنگ نے ریڈیو کو ایک نئے پلیٹ فارم تک پہنچا دیا ہے۔ اِس طرح ریڈیو کا بنیادی تصور وہی رہتا ہے: آواز کے ذریعے انسان تک پہنچنا۔ صرف ذریعہ تبدیل ہو گیا ہے۔ کل سامع کے ہاتھ میں ٹرانزسٹر تھا، آج اِسی سامع کے ہاتھ میں اسمارٹ فون ہے۔

س: دُور دراز علاقوں میں معلومات کو پہنچانے میں ریڈیو پاکستان کا کیا کردار ہے اور ریڈیو پاکستان آر کائیو کو ڈیجیٹل دور سے کیسے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے؟

ج: ریڈیو پاکستان' پاکستان کے لیے ایک بڑا اثاثہ ہے۔ ریڈیو پاکستان کی رسائی ایک اہم طاقت ہے۔ ماضی میں ایسے بہت سے علاقے تھے جہاں بجلی کی سہولت موجود نہیں تھی۔ ایسے ماحول میں ریڈیو اور خاص طور پر ٹرانزسٹر ریڈیو نے لوگوں تک معلومات اور تفریح پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ٹرانزسٹر نے ریڈیو کو بجلی کے روایتی نظام سے کسی حد تک آزاد کر دیا۔ بیٹری لگائی، ریڈیو چلایا اور معلومات لوگوں تک پہنچنے لگیں۔ یہی وجہ تھی کہ دُور دراز اور دیہی علاقوں تک بھی حکومتی پیغامات، خبریں، سماجی معلومات اور تفریح پہنچنے لگی۔ ریڈیو صرف موسیقی سُنانے والا ذریعہ نہیں تھا؛



وہ لوگوں کو ملک، دنیا اور معاشرے سے جوڑنے کا ذریعہ بھی تھا۔ ریڈیو پاکستان کے پاس کئی دہائیوں پر محیط پروگرامنگ اور مواد کا ایک غیر معمولی ذخیرہ موجود ہے۔ اور یہ ایک ایسا خزانہ ہے جس کی کوئی آسانی سے قیمت مقرر نہیں کی جا سکتی۔ ماضی کے پروگرام، موسیقی، آوازیں، گفتگو اور تاریخی مواد دراصل پاکستان کی اجتماعی یادداشت کا حصہ ہیں۔ یہاں ڈیجیٹل ٹیکنالوجی ایک بہت بڑا موقع فراہم کرتی ہے۔ اگر اِس تاریخی مواد کو مؤثر انداز میں ڈیجیٹائز، محفوظ اور عوام کے لیے قابلِ رسائی بنایا جائے تو نئی نسل ماضی کی آوازوں کو سُن سکتی ہے۔ یہ صرف آرکائیو محفوظ کرنا نہیں ہوگا بلکہ نسلوں کے درمیان رابطہ قائم کرنا بھی ہوگا۔

س: FM101 اور جدید ریڈیو کی کیا اہمیت ہے اور ریڈیو کس طرح نوجوان نسل کو مثبت سرگرمیوں کی طرف لا سکتا ہے؟

ج: FM ریڈیو آج بھی انسان کے روزمرہ سفر کا حصہ بن سکتا ہے۔ گھر سے دفتر جاتے ہوئے ریڈیو، دفتر میں ڈیجیٹل میڈیا، موبائل پر سوشل میڈیا، اور بعد میں پوڈکاسٹ یا ویڈیو یہ سب ایک ہی شخص کے میڈیا لائف سائیکل کا حصہ بن سکتے ہیں۔ FM 101 جیسے پلیٹ فارمز کے لیے مستقبل کا چیلنج صرف یہ نہیں کہ وہ ریڈیو پر کیا نشر کرتے ہیں، بلکہ یہ بھی ہے کہ:

وہ اپنے پروگرام کو موبائل پر کیسے لاتے ہیں؟

اپنی آواز کو سوشل میڈیا پر کیسے لے جاتے ہیں؟

اپنے پروگرام کو پوڈکاسٹ میں کیسے تبدیل کرتے ہیں؟

اور اپنے سامع کو صرف سامع کے بجائے کمیونٹی کا حصہ کیسے بناتے ہیں؟

یہی جدید کمیونیکیشن کی اصل سمت ہے۔ ریڈیو کا مستقبل دراصل نوجوانوں سے جُڑ جاتا ہے۔ آج کا نوجوان صرف ریڈیو سننے والا نہیں بلکہ خود بھی Content Creator ہے۔ وہ پوڈکاسٹ بنا سکتا ہے، ویڈیو تیار کر سکتا ہے، ریڈیو پروگرام کی کلپس سوشل میڈیا پر شیئر کر سکتا ہے اور ایک ہی مواد کو مختلف پلیٹ فارمز پر استعمال کر سکتا ہے۔ اِس لیے مستقبل کا ریڈیو صرف On-Air نہیں ہوگا۔

وہ On-Air + Online + On-Demand ہوگا۔

س: آپ کے خیال میں ریڈیو کیسے زندہ رہے گا اور رابطے (Communication) کا اصل مستقبل کیا ہے؟

ج: دیکھیں صدف! ہمیں میڈیا کو ختم ہونے یا زندہ رہنے کی سادہ تقسیم میں نہیں دیکھنا چاہیے۔ ہر پلیٹ فارم کا اپنا کردار ہے۔ ممکن ہے ریڈیو سُننے کا انداز بدل جائے۔ ممکن ہے ٹرانزسٹر کی جگہ موبائل فون لے لے۔ ممکن ہے روایتی ریڈیو پروگرام کے ساتھ پوڈکاسٹ، ویڈیو اور سوشل میڈیا کلپس بھی ضروری ہو جائیں۔ لیکن جب تک انسان کو معتبر معلومات، تفریح، آواز اور رابطے کی ضرورت ہے، ریڈیو کی ضرورت بھی باقی رہے گی۔ اصل کامیابی اِس میں نہیں کہ ریڈیو خود کو ڈیجیٹل میڈیا سے بچائے۔ اصل کامیابی یہ ہے کہ ریڈیو ڈیجیٹل دنیا کا حصہ بن جائے۔ اور شاید یہی اِس پوری گفتگو کا سب سے خوبصورت نتیجہ ہے: ریڈیو کا مستقبل ریڈیو سے باہر نہیں، بلکہ ریڈیو اور ڈیجیٹل دنیا کے درمیان نئے رابطے میں ہے۔ آواز کا ذریعہ بدل سکتا ہے، سامع کا انداز بدل سکتا ہے، ٹیکنالوجی بدل سکتی ہے، لیکن انسان تک پہنچنے کی ضرورت کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اور جہاں رابطے کی ضرورت باقی ہے، وہاں ریڈیو کی آواز بھی باقی رہے گی۔

دیکھیں! میڈیا کے ذرائع بدل سکتے ہیں، لیکن انسان کی معلومات، رابطے اور اظہار کی ضرورت ختم نہیں ہوتی۔ کل ریڈیو نیا تھا۔ پھر ٹیلی ویژن آیا۔ اِس کے بعد کیبل، سیٹلائٹ، ویب سائٹس اور سوشل میڈیا آئے۔ آج پوڈکاسٹ، شارٹ ویڈیوز، لائیو اسٹریمنگ اور مصنوعی ذہانت جیسے نئے ذرائع سامنے ہیں۔ لیکن ہر دور میں بنیادی ضرورت ایک ہی رہی: انسان دوسرے انسان سے رابطہ کرنا چاہتا ہے۔ اِسی لیے مستقبل اُس میڈیا کا ہوگا جو ٹیکنالوجی کے ساتھ خود کو تبدیل کر سکے اور ساتھ ہی اپنے بنیادی مقصد کو نہ بھولے۔

صدف رانی! بہت شکریہ۔

سینیٹر سرمد علی پاکستان کے معروف میڈیا اور ایڈورٹائزنگ پروفیشنل ہیں۔ وہ Jang Media Group کے Managing Directorہیں اور All Pakistan Newspapers Society (APNS)کے صدر بھی ہیں۔وہ 2024 میں سینیٹر بنے اور سینیٹ کی Standing Committee on Information and Broadcastingکے رکن سمیت مختلف پارلیمانی ذمہ داریاں بھی انجام دے رہے ہیں۔







برسی کے موقع پر

قائدِ ملت شہید لیاقت علی خان، ایک جہاں دیدہ رہنماء

تحریر: رانا غلام قادر



سولہ اکتوبر تاریخ کا وہ دن جو ہمارے دلوں کو ایک گہرے دُکھ اور ملال سے بھر دیتا ہے۔ جب ہم پاکستان کے پہلے وزیرِ اعظم، قائدِ اعظم محمد علی جناح کے سب سے قابلِ اعتماد ساتھی، اور ملتِ اسلامیہ کے سچے ہمدرد لیاقت علی خان کا یومِ شہادت منا رہے ہیں۔ وہ عظیم شخصیت جنہیں تاریخ نے 'شہیدِ ملت اور "قائدِ ملت" کے ابدی القابات سے نوازا۔

قارئین شہیدِ ملت لیاقت علی خان یکم اکتوبر 1895ء کو بھارتی پنجاب کے گاؤں کرنال میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر سے حاصل کی۔ 1918ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ سے گریجویشن کی۔ بعد ازاں برطانیہ کی آکسفورڈ یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ 1923ء میں لیاقت علی خان نے باقاعدہ سیاسی میدان میں قدم رکھنے کا فیصلہ کیا اور مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی۔ وہ 1936ء میں مسلم لیگ کے سیکریٹری جنرل بنے۔ لیاقت علی خان اپنی خداداد صلاحیتوں کے باعث جلد ہی قائدِ اعظمؒ کے قریب ہو گئے اور قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں بابائے قوم کا بھرپور ساتھ نبھایا۔ وہ 1933ء میں بیگم رعنا لیاقت علی خان سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے۔

قائدِ ملت لیاقت علی خان برٹش سرکار کی عبوری حکومت کے پہلے وزیرِ خزانہ بھی منتخب ہوئے، قیامِ پاکستان کے بعد قائدِ اعظم محمد علی جناح نے انہیں ملک کا پہلا وزیرِ اعظم نامزد کیا، جس پر قائد کے انتخاب کو درست ثابت کرنے کے لیے اُنہوں نے نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

لیاقت علی خان صرف ایک سیاست دان نہیں تھے، وہ نوزائیدہ پاکستان کی اُس کشتی کے ملاح تھے جسے قائدِ اعظم کی وفات کے بعد شدید داخلی اور خارجی طوفانوں کا سامنا تھا۔ ستمبر 1948ء میں جب بانیٔ پاکستان رخصت ہوئے تو دشمنوں کا خیال تھا کہ پاکستان بکھر جائے گا۔ لیکن لیاقت علی خان نے کمال تدبر اور پامردی سے وطنِ عزیز کی باگ ڈور سنبھالی۔ وہ لیاقت علی خان ہی تھے جنہوں نے مارچ 1949ء میں قراردادِ مقاصد (Objectives Resolution) منظور کروا کر پاکستان کے آئین کی اسلامی اور جمہوری بنیاد رکھی جس نے اِس ملک کو ایک واضح سمت دی۔ اُن کا وہ تاریخی مکا... جی ہاں، دلیری کا وہ نشان جو اُنہوں نے سرحد پار کے جارحانہ عزائم کے جواب میں لہرایا تھا، آج بھی غیرتِ قومی کی علامت بن کر ہمارے ذہنوں میں محفوظ ہے۔ اُنہوں نے دنیا کو بتا دیا تھا کہ پاکستان امن پسند ضرور ہے، لیکن اپنی خودداری پر سودا کرنا نہیں جانتا۔

قارئین جب ہم شہیدِ لیاقت علی خان کا ذکر کرتے ہیں، تو ہم اُن کی شریکِ حیات بیگم رعنا لیاقت علی خان کی قربانیوں کو فراموش نہیں کر سکتے۔ لیاقت علی خان کی اِن تعلیم یافتہ اور باہمت اہلیہ نے پاکستان کی پہلی خاتونِ اول کے طور پر ہجرت کر کے آنے والے لاکھوں مہاجرین کی آباد کاری اور خواتین کو بااختیار بنانے کے لیے دن رات ایک کر دیا۔ اِس عظیم جوڑے نے محلوں اور نوابی ٹھاٹھ باٹھ کو چھوڑ کر پاکستان کی مٹی سے وفادار رشتہ جوڑا۔ مگر افسوس! سولہ اکتوبر 1951ء کی شام... راولپنڈی کا کمپنی باغ... جہاں ہزاروں کا مجمع اپنے محبوب قائد کو سننے کے لیے بے قرار تھا۔ لیاقت علی خان نے جیسے ہی مائیک سنبھالا اور اپنے خطاب کا آغاز اِن الفاظ سے کیا: "برادرانِ ملت!"...

بس پھر کیا تھا، ایک گولی نے ملت کے اِس پاسبان کو ہم سے ہمیشہ کے لیے چھین لیا اور شہید کر دیا گیا۔ کہتے ہیں جب وہ گر رہے تھے، تو اُن کی زبان پر آخری الفاظ تھے اُنہوں نے تڑپ کر خدا سے التجا کی تھی: "خدا پاکستان کی حفاظت کرے"۔ سبحان اللہ! مرتے دم بھی دل کی دھڑکن صرف اور صرف پاکستان کے لیے تھی۔

بعد ازاں راولپنڈی کے اِس کمپنی باغ کو لیاقت باغ سے منسوب کیا گیا۔ لیاقت باغ راولپنڈی کی فضا ہو یا مزارِ قائد کا احاطہ، ہر جگہ اُن کی قربانی کی خوشبو رچی بسی ہے۔ لیاقت علی خان نے اپنی تمام دولت، جائیداد اور آخر میں اپنی جان بھی اِس مٹی پر قربان کر دی۔

ہمیں یہ سوچنا ہے کہ کیا ہم نے اُن کے خوابوں کے پاکستان کی لاج رکھی؟ شہیدِ ملت کی برسی منانے کا حق تب ہی ادا ہو گا جب ہم سب مل کر اُن کے آخری الفاظ کو اپنا نصب العین بنالیں، یعنی پاکستان کی حفاظت، اِس کی ترقی، آپسی اتحاد اور اِس کا استحکام۔ خداوندِ کریم شہیدِ ملت لیاقت علی خان کے درجات بلند فرمائے اور ہمیں اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق دے اور اُن کے وژن پر عمل کرنے کے لیے آپ کا یہ قول ہی کافی ہے جیسا کہ لیاقت علی خان نے 1950ء میں اپنے امریکی دورے کے دوران کہا "ہم نے ہمیشہ اپنے سامنے جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور سماجی انصاف کے اصولوں کو رکھا ہے۔ جیسا کہ ہمیں اسلام نے سکھایا اور اسلام میں مذہبی جبر کی کوئی گنجائش نہیں۔"

بشکریہ پی بی سی راولپنڈی



27 اکتوبر: یومِ سیاہ اور ریڈیو کی گونجتی آواز

تحریر: خو شبخت شیریں

دنیا کی تاریخ میں کچھ دن خوشیوں کی نوید لے کر آتے ہیں، جبکہ کچھ دن ایسے ہوتے ہیں جو قوموں کے دلوں پر گہرے زخم چھوڑ جاتے ہیں۔ 27 اکتوبر 1947ء کشمیر کی تاریخ کا ایسا ہی ایک سیاہ دن ہے، جب کشمیری عوام کی اُمنگوں، آزادی اور حقِ خودارادیت کو طاقت کے زور پر کچلنے کی ایک طویل داستان شروع ہوئی۔ یہ دن صرف ایک تاریخ نہیں، بلکہ لاکھوں کشمیریوں کے درد، قربانیوں اور آزادی کے لیے جاری جدوجہد کی یاد ہے۔ ہر سال 27 اکتوبر کو دنیا بھر میں کشمیری یومِ سیاہ مناتے ہیں، تاکہ عالمی برادری کو یاد دلایا جا سکے کہ کشمیر کا مسئلہ آج بھی حل طلب ہے اور کشمیری عوام اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کے حق کے منتظر ہیں۔ مظفر آباد سے میر پور، کوٹلی، راولا کوٹ اور باغ تک، آزاد کشمیر کا ہر شہر اِس عزم کی علامت ہے کہ کشمیریوں کے حقِ خودارادیت کی آواز نہ دبائی جا سکتی ہے اور نہ اِسے خاموش کیا جا سکتا ہے۔ تقسیمِ ہند کے وقت ریاست جموں و کشمیر مسلم اکثریتی ریاست تھی۔ 19 جولائی 1947ء کو آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے پلیٹ فارم سے قراردادِ الحاقِ پاکستان منظور کی گئی۔ اِس قرارداد نے ریاست کے مستقبل کے حوالے سے پاکستان کے ساتھ الحاق کی سیاسی خواہش کا اظہار کیا۔ لیکن 27 اکتوبر 1947ء کو بھارتی فوجیں سرینگر پہنچ گئیں۔ مہاراجہ ہری سنگھ کی جانب سے دستاویزِ الحاق پر دستخط کے معاملے نے ایک ایسا تنازع جنم دیا جو آج تک جنوبی ایشیا کے امن اور استحکام کو متاثر کر رہا ہے۔ پاکستان اور کشمیری عوام اِس الحاق کو متنازع سمجھتے ہیں، جبکہ بھارت اِسے اپنے موقف کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ اِس کے بعد متبوضہ جموں و کشمیر میں شروع ہونے والا تنازع کئی جنگوں، سیاسی کشیدگی اور انسانی المیوں کا سبب بنا۔ کشمیری عوام نے طویل عرصے سے اپنے سیاسی مستقبل کے فیصلے میں آزادانہ رائے دینے کا مطالبہ برقرار رکھا ہے۔ 27 اکتوبر کا پیغام واضح ہے: کشمیر کا مستقبل کشمیری عوام کی اُمنگوں اور اُن کے بنیادی حقوق کو نظرانداز کر کے طے نہیں کیا جا سکتا۔ کشمیر کی تاریخ قربانیوں، جدوجہد اور اُمید سے عبارت ہے۔ کئی دہائیوں کے دوران متبوضہ علاقے میں تشدد، جبری گمشدگیوں، گرفتاریوں، شہری آزادیوں پر پابندیوں اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے الزامات سامنے آتے رہے ہیں۔

اِن حالات نے بے شمار خاندانوں کی زندگیوں کو متاثر کیا ہے۔ خواتین نے اپنے پیاروں کی جدائی اور خاندانوں کی مشکلات کا سامنا کیا، جبکہ نوجوانوں نے بھی اِس تنازع کی بھاری قیمت ادا کی۔ ہیلث گنز کے استعمال سے شہریوں، خصوصاً نوجوانوں کی بینائی متاثر ہونے کے واقعات نے دنیا بھر میں تشویش پیدا کی۔ 5 اگست 2019ء کو بھارت نے متبوضہ جموں و کشمیر کی خصوصی آئینی حیثیت ختم کرنے کے اقدامات کیے۔ اِس کے بعد علاقے کی سیاسی، انتظامی اور سماجی صورتِ حال پر بحث مزید تیز ہو گئی۔ کشمیری شناخت، زمین، آبادی کے تناسب اور سیاسی حقوق کے تحفظ کے حوالے سے خدشات بھی سامنے آتے رہے ہیں۔ یہ تمام حالات ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ کشمیر کا مسئلہ محض سرحدوں کا تنازع نہیں، بلکہ انسانی حقوق، سیاسی آزادی اور عوامی اُمنگوں سے جڑا ہوا معاملہ ہے۔ کشمیر کے مسئلے پر اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل نے متعدد قراردادیں منظور کیں۔ اُن میں سے بعض قراردادوں میں ریاست کے مستقبل کے تعین کے لیے رائے شماری کا طریقِ کار پیش کیا گیا۔ اقوامِ متحدہ کے ریکارڈ میں کشمیر کے تنازع اور اِس کے حل سے متعلق یہ قراردادیں آج بھی اہم تاریخی دستاویزات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اِس کے باوجود مسئلہ حل نہیں ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر سال یومِ سیاہ عالمی برادری سے ایک بنیادی سوال کرتا ہے: کیا کشمیری عوام کو بھی اپنے مستقبل کے بارے میں آزادانہ رائے دینے کا حق حاصل نہیں؟ دنیا میں امن اسی وقت مضبوط ہو سکتا ہے جب طاقت کے بجائے انصاف، تصادم کے بجائے مکالمے اور مفادات کے بجائے انسانی حقوق کو اہمیت دی جائے۔ کشمیر کے مسئلے کا پُرامن حل جنوبی ایشیا کے مستقبل کے لیے بھی ضروری ہے۔ آزاد جموں و کشمیر کی تاریخ میں میر پور کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں کے لوگوں نے تحریکِ آزادی، سماجی ترقی اور قومی شناخت کے تحفظ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ میر پور کی تاریخ قربانی، محنت اور اپنے وطن سے گہری وابستگی کی داستان ہے۔ برطانیہ، یورپ اور دنیا کے دیگر حصوں میں مقیم کشمیری اپنے وطن سے رشتہ قائم رکھتے ہوئے کشمیر کے مسئلے کو عالمی سطح پر اُجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مختلف سیاسی فورمز، ذرائع ابلاغ اور انسانی حقوق کی تنظیموں کے سامنے اُن کی آواز اِس بات کا اظہار ہے کہ جغرافیائی فاصلے جذباتی وابستگی کو کم نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ میرپور صرف ایک شہر نہیں، بلکہ کشمیر سے محبت، محنت اور عالمی سطح پر کشمیری شناخت کے اظہار کی ایک نمایاں علامت بھی ہے۔ جنگیں صرف ہتھیاروں سے نہیں لڑی جاتیں۔ خیالات، سچائی، شعور اور آواز بھی تاریخ کا رخ بدلنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ریڈیو کا کردار اہم ہو جاتا ہے۔ ریڈیو ایک ایسا ذریعہ ہے جو فاصلے کم کرتا، لوگوں کو باخبر رکھتا اور مشکل حالات میں امید کا پیغام پہنچاتا ہے۔ جب خبروں تک رسائی محدود ہو، اطلاعات پر پابندیاں ہوں یا لوگوں کو اپنی بات کہنے میں مشکلات پیش آ رہی ہوں، تو مستند معلومات اور ذمہ دارانہ نشریات کی اہمیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ ریڈیو کی اصل طاقت اِس کے سگنل میں نہیں، اُس اعتماد میں ہے جو سامعین اِس کی آواز پر کرتے ہیں۔ آزاد کشمیر ریڈیو میرپور اسی ذمہ داری کے احساس کے ساتھ اپنے نشریاتی فرائض انجام دیتا ہے۔ اِس کا کردار صرف خبریں اور پروگرام نشر کرنا نہیں، بلکہ کشمیری معاشرے کی آواز بننا، مقامی مسائل کو اُجاگر کرنا، قومی شعور کو فروغ دینا اور سامعین کو باخبر رکھنا بھی ہے۔ یہ ادارہ کشمیر کی تاریخ، ثقافت، زبانوں اور عوامی احساسات کو نشریاتی صورت دینے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اِس کی آواز میں میرپور کی مٹی کی خوشبو بھی ہے، کشمیری تہذیب کی پہچان بھی اور اپنے لوگوں سے وابستگی کا جذبہ بھی۔

آزاد کشمیر ریڈیو میرپور کے لیے یومِ سیاہ محض ایک خصوصی نشریاتی موقع نہیں، بلکہ اپنے قومی، صحافتی اور سماجی کردار کی تجدید کا دن ہے۔ ہر سال 27 اکتوبر کے موقع پر خصوصی نشریات کے ذریعے کشمیر کی تاریخ، تحریکِ آزادی کے مختلف پہلوؤں، انسانی حقوق اور کشمیری عوام کی جدوجہد کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دستاویزی پروگرام، خصوصی فیچرز، ماہرین کے انٹرویوز، تاریخی واقعات پر مبنی گفتگو اور قومی و ملی نغمے اِن نشریات کا حصہ بن سکتے ہیں۔ ایسے پروگرام نئی نسل کو تاریخ سے جوڑتے ہیں، سامعین میں شعور پیدا کرتے ہیں اور کشمیر کے مسئلے کو ذمہ دارانہ انداز میں سمجھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ آج ریڈیو کا کردار روایتی نشریات تک محدود نہیں رہا۔ ایف ایم نشریات کے ساتھ سوشل میڈیا، پوڈکاسٹس، ویڈیو فیچرز اور ڈیجیٹل پلیٹ فارمز نے پیغام کو زیادہ وسیع سامعین تک پہنچانے کے نئے راستے کھول دیے ہیں۔ آزاد کشمیر ریڈیو میرپور کے لیے یہ ایک اہم موقع ہے کہ وہ جدید ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے مقامی آوازوں، کشمیری ثقافت، نوجوانوں کے خیالات اور کشمیر سے متعلق مستند معلومات کو زیادہ مؤثر انداز میں پیش کرے۔ ہماری کوشش یہی ہونی چاہیے کہ ریڈیو کی آواز صرف سُنی نہ جائے، بلکہ لوگوں کے دلوں تک پہنچے؛ صرف خبر نہ دے، بلکہ شعور بھی پیدا کرے۔ ریڈیو پاکستان کا تاریخی و ادبی جریدہ آہنگ فنِ نشریات، ادب، ثقافت اور قومی تاریخ کے اہم پہلوؤں کو قلم بند کرنے کا ایک معتبر پلیٹ فارم ہے۔ ایسے جریدے محض تحریریں شائع نہیں کرتے، بلکہ اپنے عہد کے خیالات، احساسات اور قومی ترجیحات کو محفوظ بھی کرتے ہیں۔ یومِ سیاہ کے حوالے سے آہنگ کی خصوصی اشاعت کشمیر کے مسئلے پر غور و فکر، تاریخی شعور اور ذمہ دارانہ مکالمے کو فروغ دینے کا ایک مؤثر ذریعہ بن سکتی ہے۔

یہ تحریر بھی اِسی اُمید کے ساتھ پیش کی جا رہی ہے کہ کشمیر کی تاریخ، کشمیری عوام کی مشکلات اور ریڈیو کے کردار پر گفتگو وسیع تر حلقوں تک پہنچے۔ قلم اور مائیکروفون دونوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ معلومات کو دیانت داری سے پیش کریں، انسانی وقار کا احترام کریں اور ایسے مکالمے کو فروغ دیں جو انصاف اور پُرامن حل کی راہ ہموار کرے۔ اکیسویں صدی میں پیغام پہنچانے کے انداز بدل چکے ہیں۔ آج ایک مختصر ویڈیو، ایک مؤثر پوڈکاسٹ یا سوشل میڈیا پر مستند معلومات پر مبنی پوسٹ ہزاروں لوگوں تک پہنچ سکتی ہے۔ ایسے میں کشمیر کے مسئلے کو نئی نسل کے لیے آسان، قابلِ فہم اور مستند انداز میں پیش کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ہمیں نوجوانوں کو کشمیر کی تاریخ، اقوامِ متحدہ کی قراردادوں، انسانی حقوق اور مسئلے کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ کرنا ہوگا۔ اختلافِ رائے کے باوجود مکالمے، تحقیق اور حقائق کی بنیاد پر گفتگو کو فروغ دینا ہوگا۔ میڈیا کا مقصد صرف جذبات کو اُبھارنا نہیں، بلکہ شعور پیدا کرنا، سوالات کے جواب تلاش کرنا اور عوام تک درست معلومات پہنچانا بھی ہے۔ یہی ذمہ دارانہ صحافت ہے اور یہی ریڈیو کے اداروں کی اصل قوت ہے۔

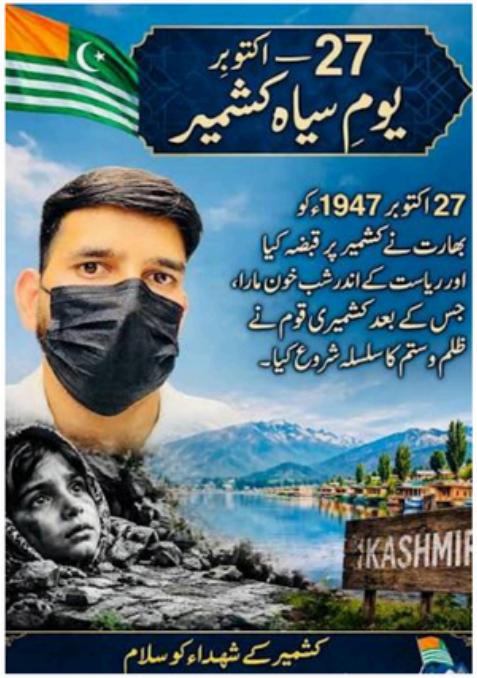

تاریخ ہمیں سکھاتی ہے کہ مشکلات کے طویل ادوار میں بھی اُمید انسان کا سب سے بڑا سہارا ہوتی ہے۔ کشمیری عوام کی تاریخ میں دُکھ بھی ہیں، قربانیاں بھی اور ایک بہتر مستقبل کی آرزو بھی۔ شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال کو کشمیر سے گہری محبت تھی۔ اُن کی شاعری میں کشمیر کی خوب صورتی، اِس کے لوگوں کی خودداری اور اِن کے دکھوں کی جھلک ملتی ہے۔ اُن کے اشعار آج بھی ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ قوموں کی اصل طاقت اُن کے شعور، کردار اور عزم میں ہوتی ہے۔ 27 اکتوبر ہمیں اپنے عہد کی تجدید کا موقع دیتا ہے۔ یہ دن ہمیں یاد دلاتا ہے کہ کشمیر کے مسئلے کو زندہ رکھنے کے لیے مسلسل تو جہ، ذمہ دارانہ صحافت، مؤثر سفارت کاری اور پُرامن کوششوں کی ضرورت ہے۔ بطور اسٹیشن ڈائریکٹر، آزاد کشمیر ریڈیو میرپور، میرا یقین ہے کہ ریڈیو کی آواز لوگوں کو جوڑنے، تاریخ کو محفوظ کرنے اور اُمید کو زندہ رکھنے کی قوت رکھتی ہے۔ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اِس قوت کو سچائی، شعور اور انسانی وقار کے فروغ کے لیے استعمال کریں۔ 27 اکتوبر کا دن ہمیں خاموش رہنے نہیں، بلکہ تاریخ کو سمجھنے، حقائق کو جاننے اور انصاف کے لیے پُرامن آواز بلند کرنے کا پیغام دیتا ہے۔ کشمیر کے لوگوں کی اُمنگوں، اُن کے بنیادی حقوق اور ایک پُرامن مستقبل کی خواہش کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ یہی وہ پیغام ہے جو یومِ سیاہ کے موقع پر دنیا تک پہنچنا چاہیے۔ آزاد کشمیر ریڈیو میرپور کی آواز اپنے سامعین کے ساتھ اِس عزم کا اظہار کرتی ہے کہ معلومات، شعور، ثقافت اور ذمہ دارانہ نشریات کے ذریعے کشمیر کی تاریخ اور عوامی احساسات کو اُجاگر کرنے کا سفر جاری رہے گا۔ کیونکہ کچھ آوازیں صرف فضا میں نہیں گونجتیں، وہ تاریخ کا حصہ بن جاتی ہیں۔

بشکریہ آزاد کشمیر ریڈیو میرپور

پاکستانی سماج کی نشوونما میں
حکیم محمد سعید کی تعلیمات اور کوششوں کا حصہ

تحریر: سعدیہ راشد



پاکستان کے سماج کے تانے بانے کی بُنت میں جو عناصر شامل ہیں اُن میں اسلام، مقامی ثقافتیں، تاریخی عوامل اور اِس خطے اور برصغیر کی بعض اہم شخصیات کے افکار نمایاں ترین ہیں۔ اِن شخصیات میں صوفیائے کرام، علمائے دین، حکمرانوں اور سیاست دانوں کے ساتھ چند ایسے نام بھی شامل ہیں جو روایتی معنوں میں صوفی تھے نہ مذہبی عالم، اُن کی وجہِ شہرت سیاست بھی نہ تھی اور نہ تاج و تخت سے اُنہیں کوئی واسطہ تھا، جیسے سرسید احمد خاں، علامہ اقبال؛ تاہم یہ تمام شخصیتیں قیامِ پاکستان سے پہلے زندگی سے ناتا توڑ چکی تھیں۔ اپنے فکر و عمل سے مسلمانانِ برصغیر اور پاکستان کے معاشرے پر اثرات مرتب کرنے والے اِن عظیم المرتبت افراد کی فہرست میں ایک دمکتا نام شہیدِ پاکستان حکیم محمد سعید کا بھی ہے، جنہیں یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اُنہوں نے قیامِ پاکستان کے بعد ہجرت کر کے اِس نوزائیدہ مملکت کو اپنا وطن بنایا اور بطور پاکستانی اِس معاشرے کی خدمت میں تاعمر مصروف رہے۔

حکیم سعید کے نام میں "حکیم" کا سابقہ اگرچہ پیشہ طب کی نسبت سے ہے، لیکن درحقیقت وہ وسیع تر معنی میں "حکیم" تھے، اُن کی شخصیت مدبر، مفکر اور فراست سے عبارت تھی۔ قومی مسائل پر اور معاشرتی خرابیوں پر مضطرب رہنا اور غور و فکر کرنا ہر مفکر کا خاصا ہوتا ہے، لیکن حکیم سعید نے اپنے اِس تفکر کو تدبیر سے آشنا کیا، اپنے غور و فکر سے حاصل شدہ نتائج پر فکرِ عمل کے منظم ڈھانچے اِستوار کیے اور اپنی تمام تر جہتوں اور توانائیوں کے ساتھ پاکستان اور پاکستانی معاشرے کی فلاح اور اصلاح میں مگن ہو گئے۔ جب ہم اِن کے افکار و تعلیمات کا بہ غور جائزہ لیتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ اِن کی فکر و تعلیم کا بنیادی نکتہ اخلاق ہے، جس کی تبلیغ اِن کی ہر تحریر و تقریر میں نظر آتی ہے۔

پاکستانی معاشرے پر حکیم سعید کے اثرات کی بات کریں تو سب سے پہلے اُس شعبے پر نظر جاتی ہے جو اُن کی بنیادی وجہِ شہرت ہے، یعنی طب کا شعبہ۔ ایک زمانہ تھا کہ ہمارے ہاں طب یونانی کو ایک زوال پذیر شعبہ سمجھا جاتا تھا، فلموں اور ڈراموں میں حکیم ایک مزاحیہ کردار کی صورت میں نظر آتا تھا، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ سماج میں طبِ مشرق کی وُقعت گھٹتی جا رہی تھی، دوسری طرف نوجوان طب یونانی کی طرف آنے سے کترانے لگے تھے۔ ایسے میں یہ حکیم محمد سعید تھے جنہوں نے پاکستان میں شعبۂ طب کو جدید ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ کیا اور اِسے عوام میں مقبول بنانے کے جتن کیے۔ پھر یہ اُن کی دل پذیر اور شان دار شخصیت کا فیض تھا کہ عام لوگوں کی نظر میں وہ حکیم جو قابلِ تمسخر اور ناقابلِ اعتبار ہوتا جا رہا تھا، ایک بار پھر قابلِ اعتبار قرار پایا، شہر شہر حکیموں کے مطب دکھائی دیتے ہیں، ٹی وی چینلوں پر ڈاکٹروں کے ساتھ مریضوں کو مشورہ دینے کے لیے حکما بھی بلائے جاتے ہیں اور نوجوانوں کی بہت بڑی تعداد حکمت کے شعبے کو بہ طور روزگار اپنانے کے لیے طبِ مشرق کی درس گاہوں کا رُخ کر رہی ہے۔ ساتھ ساتھ صحت سے متعلق آگاہی کو فروغ دینے کے لیے اُنہوں نے ادارہ ہمدرد کے تحت رسالے "ہمدرد صحت" کا اجراء کیا۔ شاید ہی کوئی پڑھا لکھا پاکستانی ہو جس نے ایک بار ہی سہی اِس رسالے کا مطالعہ نہ کیا اور اِس سے کچھ نہ کچھ فیض یاب نہ ہوا ہو۔ پاکستان میں طبِ مشرق کے فروغ اور عوام کو علاج معالجے کی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے اُنہوں نے ادارہ "ہمدرد" تو قائم کیا ہے، ہمدرد طبی کالج کا قیام عمل میں لا کر نئی مملکت میں طب کی تعلیم کو بھی فروغ دیا۔ پاکستانی معاشرے کو ذہنی بالیدگی اور فکری توانائی سے مالا مال کرنے کے لیے حکیم سعید نے جو کاوشیں کیں یقیناً پاکستانی معاشرے پر اُن کے اثرات مرتب ہوئے ہیں، جن پر جامعات کی سطح پر تحقیق کی ضرورت ہے۔

اِس ضمن میں اُنہوں نے اطفال کی ذہنی آبیاری کو اپنا ہدف بنایا۔ ہمارے مفکرین، علماء اور دانش وروں میں شاید ہی کوئی ہو جس نے پوری خصوصیت کے ساتھ بچوں کو اپنی فکری و علمی کاوشوں کا محور بنایا ہو، یہ حکیم سعید کا وہ تخصص ہے جو اُنہیں ہمارے اہلِ دانش کی انجمن میں ایک منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ اُنہوں نے بچوں کے لیے ماہ نامہ "ہمدرد نونہال" جاری کیا، کتنے ہی بچے آج یہ اعتراف کرتے نظر آتے ہیں کہ اُن کی ذہنی اور اخلاقی تربیت میں "ہمدرد نونہال" نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ اِن میں سے جانے کتنوں کی نگارشات کا سلسلہ اِسی رسالے سے شروع ہوا، اور آج وہ علم و ادب کی دنیا کے بڑے نام بن چکے ہیں۔ حکیم سعید نونہالوں کے اذہان کی آبیاری کے معاملے میں کس قدر سنجیدہ تھے اِس کا اندازہ "ہمدرد نونہال اسمبلی" کے پلیٹ فارم سے لگایا جا سکتا ہے، جس کی بنیاد 1985ء میں اُنہوں نے ڈالی۔ پاکستان میں بچوں کا یہ واحد اور نمائندہ اجتماع عشروں سے تسلسل کے ساتھ جاری ہے اور بچوں کی ایک بہت بڑی تعداد کی فکری نشوونما اور اُن کی صلاحیتوں کے اظہار کا وسیلہ بنا ہوا ہے۔ حکیم صاحب کے لگائے اِس چمن میں ہزاروں درخت جہاں پھل اور پھول دے رہے ہیں وہیں پاکستان میں تحقیق کو فروغ دینے اور محققین کی فکری جہت کو مزید سمتوں سے روشناس کروانے کے لئے سہ ماہی "ہمدرد میڈیکس"(Hamdard Medicus)، سہ ماہی "ہمدرد اسلامکس (Hamdard Islamicus) سہ ماہی جرنل "پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی"(Pakistan Historical Society) کی اشاعت کا سلسلہ باقاعدگی سے جاری ہے۔

تعلیم عام کرنا اور اِسے معیاری بنانا حکیم سعید کی اولین ترجیحات میں شامل تھا، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ تعلیم ہی ایک روشن پاکستان کی ضمانت اور ہمارے اکثر مسائل کا حل ہے۔ اپنے مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اُنہوں نے ایجوکیشن سوسائٹی بنائی، ہمدرد فاؤنڈیشن قائم کی اور "مدینۃ الحکمت" جیسا اعلیٰ معیار کا تعلیمی ادارہ وجود میں لائے۔ حکیم سعید کی فروغِ تعلیم کے لیے کی جانے والی اِن کوششوں کے نتیجے میں جہاں خواندگی میں اضافے اور معیاری تعلیم کی فراہمی کا سلسلہ دراز ہوا، وہیں نجی سطح پر فروغِ تعلیم کو مقصد بنا کر تعلیمی ادارے قائم کرنے کا رجحان تیزی سے بڑھا، ورنہ قیامِ پاکستان کے فوری بعد تو مشنری جذبے کے تحت بہت سی درس گاہیں قائم کی گئی تھیں، لیکن بعد میں یہ جذبہ سرد پڑ گیا۔

پاکستانی معاشرے کو "تھنک ٹینک" کے تصور سے عملی طور پر روشناس کرانے کا سہرا حکیم سعید ہی کے سر ہے، جنہوں نے "شوریٰ ہمدرد" کی بنیاد ڈال کر ملک بھر کے دانش وروں اور اہلِ فکر کو اپنے خیالات کے اظہار کے لیے ایک مستقل پلیٹ فارم فراہم کیا۔

حکیم سعید کا قائم کردہ یہ "ادارہ" جلد قومی مسائل و معاملات پر اجتماعی سوچ بچار، سوال اُٹھانے اور اظہارِ خیال کا منچ بن کر سامنے آیا، جہاں ہونے والی گفتگو اور تقاریر نے کسی نہ کسی سطح پر پاکستانی معاشرے کی فکری تربیت کی اور اسے سوچنے اور غور کرنے کے کئی پہلو اور جہتیں فراہم کیں۔ اِسی طرح "شام ہمدرد" کانفرنسوں اور سیمنارز کے ذریعے حکیم محمد سعید نے پاکستانیوں کو فکری مواد مہیا کرنے کے ساتھ پاکستان کے تعلیم یافتہ طبقے اور عوام کو مسلم سائنس دانوں اور مفکرین کے سائنسی اور علمی کارناموں اور جدید سائنس اور ٹیکنالوجی پر اِن کے اثرات سے بھی آگاہی فراہم کی جس کے باعث نوجوانوں میں پھیلائے جانے والے اُس احساس کم تری کو پسپا ہونا پڑا کہ بہ طور مسلمان وہ علم اور تحقیق میں مغربی اقوام کے مقابلے میں تہی داماں ہیں۔

بہ حیثیت مصنف بھی حکیم محمد سعید نے اپنے پڑھنے والوں کو ایک طرف مسلم تاریخ کے روشن پہلوؤں، اسلام کی ترقی پسند اور انسان دوست تعلیمات، مسلمان سائنس دانوں اور دانش وروں کی علمی و تحقیقی خدمات سے آگاہ کیا وہیں کھل کر پاکستان کو درپیش مسائل کی نشان دہی کی اور نوجوانوں میں حُبِ الوطنی کا جذبہ پروان چڑھانے کی کوشش کی۔ بہ طور قلم کار اور سیاح اُنہوں نے اپنی تصنیف کردہ کتابوں کے وسیلے سے اسلام سے محبت، اپنی تاریخ پر فخر اور پاکستانیت کو فروغ دیا اور اُن کی اِن کوششوں کا ثمر ہے کہ آج پاکستانی سماج کے افراد کی ایک بہت بڑی تعداد پاکستانیت سے سرشار ہے اور بہ حیثیت مسلمان اپنی تاریخ، خاص کر، اپنے بزرگوں کے علمی کارناموں پر بجا طور پر فخر کرتی ہے۔

حکیم محمد سعید کی تمام جہتوں اور پہلوؤں کو کسی ایک لفظ میں سموتے ہوئے اُن کی شخصیت بیان کی جائے تو وہ لفظ ہوگا "مصلح"۔ اُن کی تحریریں، تقریریں، کاوشیں، اقدامات اور قائم کردہ تنظیمیں اور ادارے سب کا بنیادی مقصد قوم اور معاشرے کی اصلاح تھا، اور اُن کی اصلاحی فکر اسلام، منطق اور سائنس کی بنیادوں پر استوار تھی۔ "جاگو جگاؤ" اور "آوازِ اخلاق" کی تحریکیں اور "پاکستان سے محبت کرو، پاکستان کی تعمیر کرو" کا نعرہ لگا کر انہوں نے نہ جانے کتنے ذہنوں اور قلوب کو اُجالوں سے بھرا اور افراد کے سفر کو درست سمت عطا کی۔ اِسی طرح پاکستان کے شب و قدر کو وجود میں آنے کی حقیقت کو عام کر کے اُنہوں نے اِس مملکت کو ایک خالص دینی اور روحانی بنیاد فراہم کی، پھر یہ تصور اتنا عام ہوا کہ ہر یومِ آزادی پر ہمیں یہ تذکرہ سُننے اور پڑھنے کو ملتا ہے۔

آج ہم اپنے ملک میں لاتعداد فلاحی تنظیموں اور رفاہی اداروں کو عوام اور معاشرے کی خدمت میں مصروف دیکھتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے اور تحقیق و جستجو کے ذریعے ماضی میں سفر کرتے ہوئے پاکستان کی نصف سالہ تاریخ کا باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ سماجی خدمت کو سطحِ پیمانے پر انجام دینے اور اپنے پیشے اور صلاحیتوں کو سماج کی بھلائی کے لیے پوری طرح وقف کر دینے کی شروعات پاکستان میں حکیم محمد سعید نے کی، تاہم اُن کی اِس خدمت کا مقصد بہت بلند تھا جو قوم اور معاشرے کی فکری، ذہنی اور اخلاقی تربیت پر مبنی تھا۔

میں سمجھتی ہوں کہ حکیم محمد سعید شہید کے اُفکار اور تعلیمات کے پاکستانی سماج پر اثرات کا یہ جائزہ بہت مختصر ہے، جسے پڑھ کر قارئین تشفی محسوس کرنے میں حق بہ جانب ہوں گے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اِس موضوع پر جامع تحقیق کی جانی چاہیے جو ہمیں ہمارے ایک محسن کی شخصیت اور خدمات سے بھی پوری طرح آشنا کرے گی اور ہمارے نوجوانوں کو سماج کی بہتری کے لیے کچھ کرنے کی ترغیب کا باعث بھی بنے گی۔

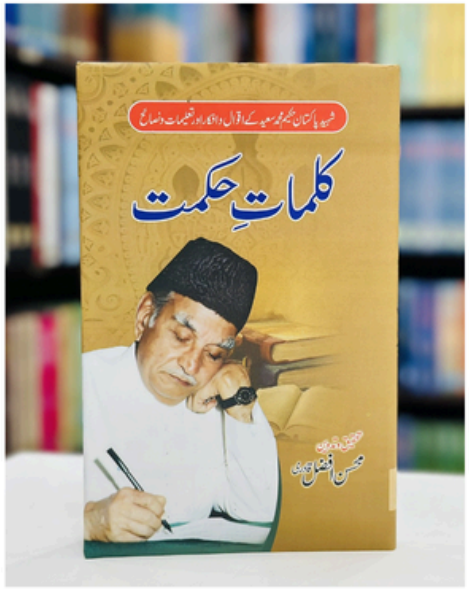

عدیہ راشد حکیم محمد سعید کی صاحبزادی ، ہمدرد فاؤنڈیشن کی سربراہ اور ہمدرد یونیورسٹی کی چانسلر ہیں۔

بشکریہ پی بی سی کراچی

نکلتے

برسی کے موقع پر

قارئین کے لئے

راجہ صاحب آف محمود آباد (راجہ امیر احمد خان)

گفتگو: خواجہ رضی حیدر



راجہ صاحب کی آواز۔۔۔

"مجھے توقین ہے کہ مستقبل درخشاں ہے، ہم نہ سہی ہمارے بعد آنے والے اِس بیڑے کو اُٹھائیں گے، اور وہ سرفروشی جو ہم میں نہ سہی اُن میں ہوگی اور اُن کی قدرت مدد کرے۔ میں مایوس نہیں ہوں، البتہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ موجودہ جو حالات اِس وقت ملک میں ہیں یا عام طور پر مسلمانوں کے ممالک میں ہیں، اُس سے دم ہے، لیکن میں مایوس نہیں ہوں، میں اِس وعدے پر بالکل پورے طور پر یقین رکھتا ہوں کہ

"وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون""

گفتگو خواجہ رضی حیدر

قیامِ پاکستان بلاشبہ قائدِ اعظم محمد علی جناح کا ایک ایسا ناور و بے مثال کارنامہ ہے، جو تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ زندہ و جاوید رہے گا۔ اگر ہم قائدِ اعظمؒ کی بیسویں صدی کے چوتھے اور پانچویں عشرے کی جدوجہد کا جائزہ لیں، تو یہ حقیقت بڑی واضح نظر آتی ہے کہ اِس دور انیے میں جن رہنماؤں نے قائدِ اعظمؒ کے ساتھ دامے، درمے، سخنے غیر مشروط تعاون کیا، اُن میں اودھ کی ریاست محمود آباد کے والی راجہ امیر احمد خاں نہ صرف سرِ فہرست تھے بلکہ قائدِ اعظمؒ اُن پر اِس قدر اعتماد اور اعتبار کرتے تھے کہ بعض اہم مواقع پر اُن کو اپنی نیابت کے لیے بھی منتخب کیا۔

راجہ امیر احمد خاں کے والد مہاراجہ محمد علی محمد خاں سے بھی قائدِ اعظم محمد علی جناح کے ایسے دیرینہ مراسم تھے کہ دونوں ایک دوسرے کی ذاتی زندگی کے امور میں بھی شریک تھے۔ جیسا کہ اپریل 1918ء میں محمد علی جناح کی رتن بائی سے شادی کے موقع پر مہاراجہ محمد علی محمد خاں بہ طور وکیل موجود تھے اور 1930ء میں مہاراجہ محمود آباد نے جب اپنی ریاست کے انتظامی امور کے حوالے سے ایک ٹرسٹ قائم کیا تو اُس کا ایک رُکن محمد علی جناح کو بھی نامزد کیا۔ یہی سبب تھا کہ راجہ امیر احمد خاں آف محمود آباد، قائدِ اعظم محمد علی جناح کو انکل اور محترمہ فاطمہ جناح کو پھوپھی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

راجہ امیر احمد خاں آف محمود آباد 5 نومبر 1914ء کو محمود آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے خانوادے کے علماء سے حاصل کی۔ مشرقی علوم کی مکمل تدریس کے بعد مغربی علوم کی تربیت ایک انگریز پروفیسر جے۔ اے چپ مین سے حاصل کی۔ جرمن زبان کی تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے معروف پروفیسر عبدالستار خیری سے حاصل کی۔ اِس کے بعد لکھنؤ کے لا مرٹین یر کالج میں داخلہ لے کر سینئر کیمبرج کا امتحان پاس کیا۔ وہ ابھی تعلیم مکمل بھی نہ کر سکے تھے کہ مئی 1931ء کو اُن کے والد مہاراجہ محمد علی خاں محمد کا انتقال ہو گیا۔ اُس وقت راجہ امیر احمد خاں کی عمر تقریباً ساڑھے سولہ سال تھی، مگر تدبر و فراست اور علمی لیاقت اِس قدر تھی کہ کم عمری کے باوجود اُنہوں نے نہ صرف ریاست کا انتظام سنبھالا بلکہ اُن تعلقات اور تحریکات سے بھی خود کو دور نہیں کیا جن کی بنیاد اُن کے والد نے رکھی تھی۔ قومی سیاست راجہ صاحب محمود آباد کو ورثے میں ملی تھی لہٰذا اِس حوالے سے غور و فکر اُن کا معمول تھا۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح سے خاندانی روابط کی بنا پر وہ نہ صرف اپنے بچپن ہی سے اُن سے مانوس ہو گئے تھے بلکہ اُن کی سیاسی فکر کو بھی پسند کرتے تھے جبکہ قائدِ اعظمؒ بھی اُن کو اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے۔

1933ء میں راجہ امیر احمد خاں نے جب وہ مشرقِ وسطیٰ اور یورپی ممالک کے دورے پر تھے لندن میں قائدِ اعظم محمد علی جناح سے ملاقات کی۔ بحوالہ تاریخ اِس ملاقات میں راجہ امیر احمد خاں نے قائدِ اعظمؒ سے جہاں اپنے خاندانی امور کے بارے میں بات چیت کی وہاں قائدِ اعظمؒ سے درخواست کی کہ وہ جلد ہندوستان واپس آ کر ازسرِ نو مسلمانوں کی قیادت سنبھالیں۔

قائدِ اعظمؒ کے ہندوستان واپس آنے اور آل انڈیا مسلم لیگ کی ازسرِ نو قیادت سنبھالنے کے بعد راجہ صاحب محمود آباد نے 1936ء میں آل انڈیا مسلم لیگ میں شمولیت کا فیصلہ کیا۔ وہ آنے والے دنوں میں نہ صرف مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے رُکن منتخب ہوئے بلکہ مسلم لیگ کے مرکزی خزانچی بھی مقرر ہوئے۔ اِن دونوں عہدوں پر راجہ صاحب محمود آباد قیامِ پاکستان تک خدمات انجام دیتے رہے۔ راجہ صاحب محمود آباد کی سیاسی سوجھ بوجھ اور حکمتِ عملی کا اصل مظاہرہ آل انڈیا مسلم لیگ کے پچیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ کے موقع پر ہوا جس کی استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین وہ خود تھے اور اِس کی صدارت قائدِ اعظم محمد علی جناح کے سپرد تھی۔ یہ اجلاس اپنی اہمیت کے نتائج کے اعتبار سے ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی استحکام کے لیے جہاں دُور رس نتائج کا حامل ثابت ہوا، وہاں اِس سے آل انڈیا مسلم لیگ کو بھی حیاتِ نو میسر آئی۔ اِسی اجلاس سے قائدِ اعظمؒ اور مسلم لیگ نے عوامی سیاست میں بہ یک وقت داخل ہونے کا اعلان کیا۔ اِس اجلاس میں راجہ صاحب محمود آباد نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں واضح طور پر اعلان کیا کہ اب ہندوستان کے مسلمان اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے نہ صرف بیدار ہو چکے ہیں بلکہ وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح متحد ہو چکے ہیں۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ہندوستان کی آزادی اب اِسی صورت میں ممکن ہے کہ جب مسلمانوں کو برابری کی بنیاد پر اُن کے حقوق دیے جائیں گے۔ ہم اپنی آخری سانس تک دو قومی نظریے کی بنیاد پر جدوجہد کرتے رہیں گے۔

راجہ صاحب محمود آباد کی لکھنؤ اجلاس میں کامیابی کا ہی نتیجہ تھا کہ دسمبر 1937ء کو کلکتہ کے ایک اجلاس میں راجہ صاحب آف محمود آباد کو مسلم طلباء کی تنظیم آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن کا پہلا صدر منتخب کیا گیا اور انہوں نے ہندوستان کے تمام مسلمان طالب علموں کو متحد کر کے آل انڈیا مسلم لیگ کی جدوجہد کو تقویت پہنچائی۔ علیحدہ مسلم وطن کے قیام کے لیے لاہور میں مارچ 1940ء کی قرارداد منظور ہونے تک راجہ صاحب محمود آباد نہ صرف مسلمانوں کے ایک مقبول اور ہر دل عزیز رہنما کے طور پر معروف ہو چکے تھے بلکہ قائد اعظم محمد علی جناح بھی تمام سیاسی امور میں اُن کے مشوروں کو بہت اہمیت دینے لگے تھے۔ اُنہوں نے مسلم لیگ کی تنظیم نو اور مطالبۂ پاکستان کو مقبول بنانے کے لیے مسلسل ہندوستان گیر دورے کیے، مختلف علاقوں میں مسلمان رہنماؤں کے ساتھ ملاقاتیں کر کے اُن کی پاکستان کے حوالے سے ذہن سازی کی اور پاکستان کے قیام کو یقینی بنانے کے لیے ہر سطح پر خود کو وقف کر دیا۔

راجہ صاحب محمود آباد نے جہاں قیامِ پاکستان کے لیے بے مثال جدوجہد کی، وہاں اُنہوں نے پاکستان کے قیام کے بعد استحکامِ پاکستان کے لیے بھی اہم خدمات انجام دیں۔ اُن کی ہر لمحہ یہی کوشش رہتی تھی کہ پاکستان سلامتی اور استحکام کے ساتھ ایک مثالی ملک کے طور پر پوری دنیا میں شناخت کیا جائے۔ 1968ء میں راجہ صاحب محمود آباد نے اسلامک کلچرل سینٹر لندن کے ڈائریکٹر کا عہدہ قبول کر لیا اور پاکستان سے مستقل طور پر برطانیہ منتقل ہو گئے۔ اِس عہدے کو قبول کرنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ اِس سینٹر کے ذریعے اسلام اور عالمِ اسلام کی بہتر طور پر خدمت کر سکیں۔ اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اُنہوں نے شدید محنت کی اور خود کو بے پناہ مصروف کر لیا جس کے نتیجے میں 13 اکتوبر 1973ء کو اُنہیں دل کا شدید دورہ پڑا۔ چوبیس گھنٹے موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد اُنہوں نے 14 اکتوبر 1973ء کو 59 سال کی عمر میں اپنی جانِ جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا۔

(یہ گفتگو ریڈیو پاکستان کراچی سے نشر کی گئی۔ پروڈیوسر میمونہ شمیل حورانی)



خواجہ رضی حیدر پاکستان کے نامور محقق ، تذکرہ نگار ، صحافی اور شاعر ہیں۔ قائد اعظمؒ اکیڈمی کے سربراہ رہے ہیں ۔ قائد اعظمؒ اور تحریک پاکستان پر متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ دیگر کُتُب کے علاوہ راجہ آف محمود آباد پر بھی کتاب لکھ چکے ہیں۔

بشکریہ پی پی سی کراچی

برسی کے موقع پر

ہمہ پہلو شاعر دلنواز اور ادیب
حضرتِ بہزاد لکھنوی

تحقیق و تحریر : محمد ظہیر بدر

عام طور پر محاورتاً کسی شخص کے اوصاف اور گنوں کو بیان کرتے ہوئے ادا کیا جاتا ہے۔ موصوف اپنی ذات میں انجمن تھے اہیں۔ لیکن بہزاد لکھنوی کے بارے میں یہ جملہ حقیقی معنوں میں ادا کریں تو غلط نہیں ہو گا۔ بہزاد لکھنوی بیک وقت ہمہ فن شخصیت کے مالک تھے۔ اُن کے فن کا محاکمہ کرنے کے لیے کئی دفتر درکار ہیں ۔ لیکن مذکورہ سطور میں اُن کے فن اور شخصیت پر تذکرہ مشتے از خروارے کے مصداق ہے۔

سردار حسین خاں نے یکم جنوری 1900ء کو لکھنو میں جنم پایا۔ بیسویں صدی کا آغاز تھا۔ برصغیر کی تہذیبی زندگی شعر و ادب اور مصوری و موسیقی کے خوش رنگوں سے عبارت ہوا کرتی تھی۔ بہزاد لکھنوی کو بھی اپنے گھرانے میں یہی ماحول ملا۔ جب بہزاد لکھنوی نے آنکھ کھولی اور سن شعور کو پہنچے تو شعر قرطاسِ کُتب سے اتر کر اور مشاعروں سے نکل کر جدید ابلاغی ذرائع تک رسائی پا رہا تھا۔ ریڈیو کی ایجاد اور اُس کے بعد گراموفون ریکارڈوں کی آمد، گائیکی درباروں اور امراء کی محافل و مجالس میں نمو پاتے پاتے ریڈیو اور گراموفون کمپنیوں تک آ پہنچے تھے۔ سینما کے پردے پر قدیم و کلاسیک ڈرامے کی ہیت فلم کے اسکرپٹ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ شاعری گیتوں میں اور پردۂ سیمیں پر جلوہ گر ہونے لگی تھی۔ فنونِ لطیفہ سے محظوظ ہونے کا حق خواص و امراء اور نوابین کے ساتھ ساتھ عوام کو بھی حاصل ہونے لگا تھا۔ اِن ذرائع ابلاغ اور وسائل نے لامحالہ طور پر شاعروں، ادیبوں، گویوں اور فن و ادب کے فروغ اور ترقی کے لیے اپنا اہم کردار ادا کیا۔

بہزاد لکھنوی کی فنی و ادبی زندگی کا یہ پیش منظر تھا۔ گھر کے ماحول سے مذاقِ شعر و ادب لے کر نکلنے والے سردار حسین خاں نے دورِ طالب علمی میں طلسمِ ہوش ربا کے مطالعے سے اپنے ادبی ذوق کی آبیاری کی۔ اُنہوں نے طلسم ہوش ربا کے کردار "بہزاد" سے متاثر ہو کر اپنا تخلص بہزاد رکھ لیا۔ یوں سردار حسین خان نے بہزاد لکھنوی کا چولا بدل لیا جو زندگی بھر اُن کی پہچان بنا۔

اُنہوں نے بارہ برس کی عمر میں شعر کہنے کا آغاز کیا۔ اُن کی شاعری میں شوخی اور طنطنہ بعض اوقات اُستاد داغ دہلوی کی یاد دلاتا ہے۔ بہزاد لکھنوی نے دبستانِ شعر میں اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی ،سہ لگانہ و غیرہم کی شعری روایات سے بھی خوب استفادہ کیا۔ اُس دور میں مشاعرے برصغیر کی معاشرتی زندگی کی تہذیبی علامت تھے۔ بہزاد نے بھی مشاعرے پڑھے مگر بہزاد صرف مشاعراتی شاعر نہیں تھے۔ اُنہیں قدرت نے اور بھی صلاحتیں عطا کی تھیں جن کو بروئے کار لاتے ہوئے اُنہوں نے جدید دور کے ابلاغی وسائل تک رسائی حاصل کی۔ کچھ عرصہ ریلوے کی ملازمت کی مگر افتادِ طبع کے باعث جلد ہی اِس ملازمت سے فراغت لے کر آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہو گئے۔

قیامِ پاکستان کے بعد کراچی کو مسکن بنایا۔ لکھنوی تہذیب کی بازگشت۔ ہندوستانی فلمی اور ریڈیو کی ملازمت کا تجربہ اور نئے ملک کی بنتی ہوئی معاشرتی اور ادبی اقدار کے ابتدائی دور کی صورتِ حال اور نئی ریاست کے چیلنجوں کے براہِ راست ادب و ثقافت پر اثرات، یہ وہ عوامل تھے جنہوں نے یہاں اُن کے ادب و فن میں مزید نکھار اور پختگیِ افکار پیدا کی۔

کچھ دیر میونسپل کارپوریشن کی ملازمت کرنے کے بعد وہ ریڈیو پاکستان کراچی سے وابستہ ہو گئے۔ ریڈیو کی ضروریات نے اُن کی ادبی جہات کو جو مہمیز لگائی تھی وہ آئندہ ریڈیائی اور ادبی زندگی میں اُن کے بہت کام آئی۔ ریڈیو کے مائیک پر اور مشاعرے پڑھنے میں صوتی امتیاز اور غزل گوئی کے ساتھ گیت نگاری براڈکاسٹنگ نے اُن کی خداداد صلاحیتوں کو صیقل کرنے کے مواقع اور راہیں فراہم کیں۔ فلموں میں گیت لکھے۔

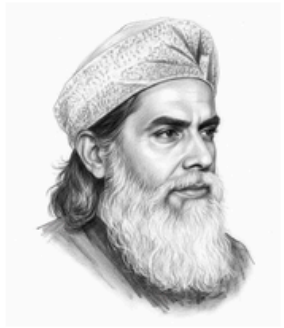

غزل گوئی میں مترنم بحور کا استعمال کیا۔ احساسات و جذبات اور کربِ نارسائی اور دلی اضطراب اور طنطنہ و تفاخر اُن کی غزل کے اہم پہلو ہیں۔

اے جذبۂ دل گر میں چاہوں ہر چیز مقابل آ جائے
منزل کے لیے دو گام چلوں اور سامنے منزل آ جائے

اُن کی مشہور غزل جو فلم کا حصہ بننے کے علاوہ بہت سے گلوکاروں اور گلوکاراؤں نے گائی۔ اِس غزل کا ہر شعر اُن کے منفرد رنگِ غزل پر دال ہے۔ بہزاد کا شعری سرمایہ؛ غزل، گیت میں جدت و کلاسیکیت کے امتزاج اور نعت و منقبت و مراثی میں عقیدت و عشق و مدت اور سوز و الم سے معمور ہیں۔ آپ نے اپنے مرشد و ہادی شاہ محمد تقی عرف عزیز میاں راز نظامی نیازی سجادہ نشین خانقاہِ نیازیہ بریلی کا مجموعہ کلام "رازِ نیاز" کے نام سے مرتب کیا۔ اُن کا شعری مجموعہ "نقشِ بہزاد" انہی کے نام معنون ہے جس کی شاعری؛ تصوف و معرفت اور جذب و سلوک سے مشکبار ہے۔ بطور مرتب اُن کی دو تصانیف کے نام ملتے ہیں۔

اُن کی شعری تخلیقات؛ آوِنا تمام، مصحفِ بہزاد، موجِ نور (بہزاد لکھنوی کے سو گیت)؛ چراغِ طور، موجِ طور، بیانِ حضور، وجد و حال،، نغمۂ روح، کرم بالائے کرم۔۔۔۔ میں شاعری کی جملہ جہات میں اُن کی قادرالکلامی کا احساس ہوتا ہے۔

شاعری کے ساتھ میدانِ نثر میں بھی اُن کا اشہبِ قلم جولانیاں دکھاتا دکھائی دیتا ہے۔ اُن کے ناولوں میں: بہرام کی واپسی، پیدائشی جاسوس، حسین قاتل، پیلی چھتری، بیٹے کا قاتل کے علاوہ اُن کا عالمی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والے، حکیم بدھن کی مہمات پر مبنی مضامین کا سلسلہ ہے (جسے تشکیل عادل زادہ اور سید حسن نواب نے مرتب کر کے "حکیم بدھن" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کروایا) اِس کے علاوہ بچوں کے لیے لکھی گئی دلچسپ اخلاقی کہانیاں بعنوان منڈی بیر بھی شائع ہو چکی ہیں۔ اُن کی شخصیت کے محاسن و محاکم اور سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے احمد رضا بریلوی کا یہ مصرع بہزاد لکھنوی پر بھی صادق آتا ہے۔

جس سمت آ گئے ہو سکے جما دیے ہیں

حضرت بہزاد لکھنوی کی غزل گوئی سے نعت گوئی اور دیگر ادبی و علمی اور فنی جہات کو محیط یہ سفر آخر 10 اکتوبر 1974ء کو سفرِ آخرت میں ضم ہوا۔ اُن کا مرقدِ منور اسٹی حسن کراچی کے قبرستان میں مرجعِ خاص و عام ہے۔

میں بہزاد ہوں مستِ یادِ محمد۔۔۔۔۔۔ مقدر نے بخشا یہ حال اللہ اللہ

بشکریہ پی پی سی لاہور

برسی کے موقع پر

قمر جلالوی

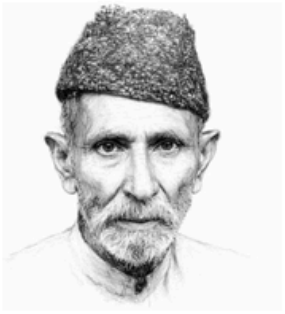

تحریر: ڈاکٹر ذی شان تبسّم

میرٹھ، اُستاد سیّد محمد حسین عابدی قمر جلالوی بیسویں صدی کے ایک معروف، قادرالکلام اور مقبول ترین غزل گو شاعر ہیں۔ وہ یکم اکتوبر 1887ء کو ہندوستان کے ضلع علی گڑھ کے ایک تاریخی و تہذیبی قصبے جلالی میں پیدا ہوئے۔ اُن کا تعلق ایک خوش حال زمیندار گھرانے سے تھا تاہم اپنی شاعرانہ افتادِ طبع اور بے جا دریادلی کی وجہ سے اُنہوں نے انتہائی کسمپرسی اور معاشی تنگ دستی میں زندگی گزاری، لیکن اپنے فن کی بدولت اُردو غزل کے اُفق پر وہ مقام حاصل کیا جس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔

قصبہ جلالی میں باقاعدہ اسکول یا کالج نہ ہونے کی وجہ سے اُنہوں نے عربی، فارسی اور اُردو کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ اُن کے والد سید غلام سجاد حسین عابدی بھی موزوں طبع تھے اور باقاعدہ شاعری کرتے تھے جس کی وجہ سے شعر و شاعری کا ذوق اُنہیں ورثے میں ملا۔ قمر جلالوی نے محض آٹھ سال کی عمر سے اشعار کہنا شروع کر دیے تھے۔ کم عمری میں ایک مشاعرے میں یہ مشہور غزل پڑھی جس نے ادبی حلقوں کو چونکا دیا:

جیسا کہ مجھ کو عشق ہے اُس گل بدن کے ساتھ
بلبل کو بھی نہ ہوگا وہ شاید چمن کے ساتھ

جوان ہوئے تو معاش کی تلاش میں میرٹھ اور پھر علی گڑھ میں سائیکل مرمت کرنے کی دوکان کھولی۔ برصغیر میں عام طور پر دوکان داروں یا پنکچر لگانے والوں کو "اُستاد" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ تاہم، قمر جلالوی کا پیشہ عالم تھا کہ محض 22 سے 24 سال کی عمر میں ہی بڑے بڑے نوخیز اور بزرگ شعراء اُن سے اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے تھے۔ چنانچہ دوکان کا یہ لفظ "اُستاد" اُن کی فنی مہارت کا اعتراف بن گیا اور وہ علم و ادب کی دنیا میں "اُستاد قمر جلالوی" کے نام سے ہمیشہ کے لیے امر ہو گئے۔

تقسیم ہندوستان کے بعد وہ ہجرت کر کے 11 ستمبر 1947ء کو پاکستان منتقل ہو گئے اور کراچی میں سکونت اختیار کی۔ کراچی میں بھی اُنہوں نے گزر بسر کے لیے پاکستان کوارٹرز میں سائیکل کی دکان چلائی۔ جب مشہور خطیبِ آلِ محمد علامہ رشید ترابی کو اُن کے معاشی حالات کا علم ہوا، تو اُنہوں نے 1959ء میں حکومتِ پاکستان سے اُن کا ڈیڑھ سو روپے کا تاحیات ادبی وظیفہ مقرر کروا دیا۔ صدرِ پاکستان ایوب خان نے اُنہیں ایک جلسے میں پانچ سو روپے کا عطیہ بھی پیش کیا۔ آخری عمر میں وہ یرقان (Jaundice) کے مرض میں مبتلا ہوئے اور 24 اکتوبر 1968ء کو کراچی میں اُن کا انتقال ہوا۔ اُنہیں کراچی کے علی باغ قبرستان میں دفن کیا گیا۔ اُن کی قبر کے لوحِ مزار پر اُن کا یہ تاریخی شعر کندہ ہے:

ابھی باقی ہیں پتوں پر جلے تنکوں کی تحریریں
یہ وہ تاریخ ہے بجلی گری تھی جب گلستاں پر

قمر جلالوی کی سب سے بڑی طاقت اُن کی لسانی گرفت اور روزمرہ کا فطری استعمال تھی۔ اُن کا فن "سہلِ ممتنع" کی بہترین مثال ہے۔ ناقدین کے مطابق قمر کی غزل میں ایک خاص قسم کا مکالماتی یا ڈرامائی انداز پایا جاتا ہے۔ وہ سیدھی بات کو اِس انداز سے کہتے ہیں کہ وہ سامع کے دل میں اُتر جاتی ہے۔ اُن کے ہاں فلسفیانہ گہرائی یا کنائی تفکر کی شدت کم ہے، لیکن زبان کا ذائقہ اور اثر پذیری بہت زیادہ ہے۔ وہ لفظوں کی بندش اور بحروں کے نبھاؤ کے بے تاج بادشاہ تھے۔ اُردو شاعری کی تاریخ میں دبستانِ دہلی اپنے "سوز و گداز اور سادگی" کے لیے جانا جاتا ہے، جبکہ دبستانِ لکھنؤ "رعایتِ لفظی، محاورہ بندی اور ظاہر داری" کے لیے مشہور ہے۔ قمر جلالوی کی شاعری اُن دونوں دبستانوں کا سنگم ہے۔ جہاں اُن کے ہاں لکھنؤی رنگ کی نزاکت اور محاوروں کی بھرپور چاشنی ملتی ہے وہیں اُن کی ذاتی زندگی کے دُکھوں، کسمپرسی اور ہجرت کے کرب نے اُن کے کلام میں دہلی والا سوز و گداز اور داخلیت پیدا کر دی ہے۔ اُن کے ہاں غمِ عشق اور غمِ روزگار اِس طرح مدغم ہوتے ہیں کہ وہ تقدیر کا شکوہ بھی کرتے ہیں تو اُس میں ایک باوقار عاجزی ہوتی ہے۔

اُستاد قمر جلالوی کو قادرالکلام شاعر اِس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ طویل اور مشکل بحروں میں بھی روایتی مضامین کو نہایت آسانی سے باندھ لیتے تھے۔ اُنہوں نے کسی بھی وقتی و ہنگامی تحریک کا حصہ بنے بغیر کلاسیکی غزل کی روایتی آبرو کو برقرار رکھا۔ اُن کی ذاتی زندگی کی تلخیوں اور معاشی محرومیوں کا عکس ان کی غزلوں میں ملتا ہے۔ اُن کی آواز میں غضب کا سوز اور ترنم میں دلوں کو چھو لینے والی کشش تھی جس کی وجہ سے وہ مشاعروں کے کامیاب ترین شاعر سمجھے جاتے تھے۔ مشاعرہ پڑھنے میں اُنہیں ایسا کمال تھا کہ وہ موقع کی مناسبت سے فی البدیہہ اشعار کہتے اور مشاعرہ لوٹ لے جاتے۔

یہ امر باعثِ تعجب ہے کہ اپنے وقت کے اِس مقبول ترین شاعر کی زندگی میں اُن کا کوئی مجموعۂ کلام شائع نہ ہو سکا۔ تاہم ان کی وفات کے بعد اُن کے بیٹی کنیز فاطمہ اور دیگر مداحوں اور قدردانوں نے اُن کا کلام جمع کر کے کتابی شکل میں شائع کیا۔ اُن کے مشہور مجموعوں میں "رشکِ قمر"، "اوجِ قمر"، "تجلیاتِ قمر"، "نغمِ جاوداں" اور "عقیدتِ جاوداں" معروف ہیں۔

عام طور پر لوگ قمر جلالوی کو صرف ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں، لیکن اُن کا ایک بڑا تعارف اُن کی مذہبی شاعری، سلام اور مراثی ہیں۔ اُن کے مجموعے "نغمِ جاوداں" اور "عقیدتِ جاوداں" میں اُن کے لکھے ہوئے مرثیے اور نوحے شامل ہیں جن میں کربلا کے مصائب کو لکھنوی مرثیہ نگاری کے روایتی عروض کے مطابق نہایت پُردرد انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ قمر جلالوی کی مذہبی شاعری بقول علامہ سیّد نصیر الاجتہادی "مرگِ پسر پر کس طرح صبر ہوتا ہے" اور "محرابِ خنجر کے نیچے کس طرح شکر ہوتا ہے" کی تفسیر ہے۔

اُن کی غزلوں کو برصغیر کے نامور گلوکاروں جیسے منی بیگم (مریضِ محبت اُنہیں کا فسانہ سناتا ہوں نکلے نکلے)، حبیب ولی محمد (کب میرا نشیمن اہلِ چمن گلشن میں گوارا کرتے ہیں)، ملکہ ترنم نور جہاں (کبھی کہانہ کسی سے ترے فسانے کو) غلام علی، آشا بھوسلے، عابدہ پروین، سلمان علوی اور صابری برادران وغیرہ نے گایا اور غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔

اُستاد قمر جلالوی اُردو کی کلاسیکی غزل کی روایت کا وہ آخری درخشندہ ستارہ تھے، جنہوں نے عروض و قوافی کی تمام تر باریکیوں کو برقرار رکھتے ہوئے شاعری کو عوامی دلوں کی دھڑکن بنا دیا۔ ایک غریب سائیکل مکینک سے "اُستاد الشعرائی" تک کا اُن کا سفر اُن کی غیر معمولی خداداد صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

بشکریہ پی بی سی بہاولپور

برسی کے موقع پر

اُستاد قمر جلالوی، سائیکل سے جُڑی کراچی کی دو حقیقی کہانیوں میں سے ایک کا لازوال کردار

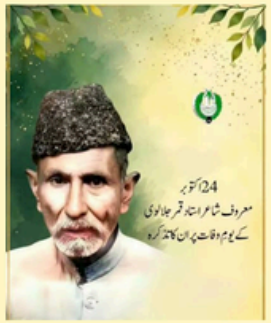

تحریر: محمد سعید احمد شیخ

1947ء کے بٹوارے کے بعد کراچی کے حصے میں بڑے جید، جاندار اور پکے ٹھکے اُردو اہلِ قلم آئے، ایسے کہ اُردو ادب کی کسی بھی مستند یا غیر مستند تاریخ سے اگر اُن کا تذکرہ منہا کر دیا جائے تو شاید یہ کتاب اپنے آدھے صفحات سے محروم ہو جائے۔

تاہم اِن نُدرہ رُوزگار اہلِ علم میں سے دو دُرِ نایاب ایسے بھی گزرے ہیں جن کی زندگیوں میں سائیکل کا تذکرہ کچھ عجیب سی یاسیت اور اداسی لے کر آتا ہے: ایک اُردو کے ممتاز افسانہ نگار اعظم کریوی (1899-1955)اور دوسرے منفرد البیان شاعر اُستاد قمر جلالوی(1887-1968)۔

اعظم کریوی، کرئی گاؤں (ضلع الہ آباد) سے مہاجرت کے بعد کراچی میں آن آباد ہوئے تھے۔ اِس محنت کش کا بیل مزدوری پر گزر بسر تھا۔ 22 جون 1955 کی رات نائٹ شفٹ کی ڈیوٹی کے بعد اپنی سائیکل پر بل سے گھر کو لوٹ رہے تھے کہ کراچی کے درگھ روڈ ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک بدبخت نے اُن سے سائیکل چھیننے کی کوشش کے دوران، اُن کی مزاحمت پر اُن کے سر پر آہنی سریے سے وار کر کے اُنہیں قتل کر دیا۔ یوں ایک سائیکل، اُردو ادب کو منٹو اور غلام عباس کے پائے کے افسانہ نگار سے محروم کر گئی۔

ممکن ہے اُردو ادبی تاریخ کے کسی نوآموز کو اعظم کریوی کا تذکرہ عجیب لگے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہی بظاہر غیر معروف اعظم کریوی اتنے بڑے افسانہ نگار تھے کہ جامعہ کراچی سے اُن کی افسانہ نگاری پر ڈاکٹریٹ کا تحقیقی مقالہ (اُردو افسانے کی تشکیلی روایت میں اعظم کریوی کا حصہ از ڈاکٹر محمد حامد کمال ناروی)، لکھا جا چکا ہے۔

اُستاد قمر جلالوی کا تذکرہ بھی ہر طور سے سائیکل ہی سے جا جُڑتا ہے۔ یہ پہلے متحدہ ہندوستان میں میرٹھ اور علی گڑھ کے علاقوں میں سائیکلوں کی مرمت کر کے روزی کماتے رہے اور پھر 1947ء میں تقسیمِ ہند کے بعد کراچی ہجرت کر کے پاکستان کوارٹرز میں سائیکلوں کی مرمت اور پنکچر لگانے کی دکان کرتے رہے۔ دن بھر سائیکلوں کی مرمت کرتے اور شام کو شاگردوں کے کلام کی اِصلاح کرتے یا مشاعروں میں شرکت کے لیے روانہ ہو جاتے۔

اعظم کریوی کی طرح اُردو غزل کے اِس صاحبِ کمال اُستاد نے بھی مہاجرت کے بعد کی زندگی کراچی شہر میں گزاری۔

آج پاکستان کوارٹرز میں سائیکلوں کی دکان کرنے والے اِنہی اُستاد قمر جلالوی کی 58 ویں برسی ہے۔ اُنہوں نے 24 اکتوبر 1968ء کو یہیں کراچی میں وفات پائی۔ وہ اُستاد قمر جلالوی جنہیں اُستاد نصرت فتح علی خان تک نے گایا:

اُن کی طرف سے ترکِ ملاقات ہو گئی
ہم جس سے ڈر رہے تھے، وہی بات ہو گئی
آئے ہیں وہ مریضِ محبت کو دیکھ کر
آنسو بتا رہے ہیں، کوئی بات ہو گئی

اُستاد قمر جلالوی کا اصل نام سیّد محمد حسین عابدی تھا۔ 1887ء میں علی گڑھ کے قصبے جلالی میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد، سید غلام سجاد حسین، بھی شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے اور خود بھی شعر کہتے تھے۔ ابتدائی فیرر سی تعلیم گھر پر حاصل کی اور سید زندہ علی سے اُردو اور فارسی پڑھی۔

قمر جلالوی کو کسی تعلیمی ادارے میں باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع تو نہیں ملا، لیکن زبان و ادب سے اُنہیں غیر معمولی شغف تھا۔ محض آٹھ برس کی عمر میں شعر گوئی شروع کر دی اور بیس برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے علی گڑھ اور دوسرے شہروں کے مشاعروں میں بطور شاعر شرکت کرنے لگے تھے۔

معاش کے لیے قمر جلالوی نے سائیکلوں کی مرمت کا پیشہ اختیار کیا۔ اپنے آبائی قصبے جلالی سے میرٹھ چلے گئے، جہاں سائیکلوں کی مرمت کی ایک دکان پر کاریگر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ بعض سوانحی تذکروں میں ضلع علی گڑھ میں اُن کی اپنی سائیکلوں کی دکان کا ذکر بھی ملتا ہے۔ یوں شعر و سخن کے ساتھ سائیکلوں کی مرمت کا پیشہ بھی اُن کی زندگی کا مستقل حصہ بن گیا۔

قمر جلالوی شاعری میں امیر مینائی کو اپنا روحانی اُستاد مانتے تھے، اگرچہ اُن سے باقاعدہ تلمذ کا ثبوت نہیں ملتا۔ اُن کے نام کے ساتھ اُستاد کا سابقہ کیسے لگا، اِس بارے میں دو مختلف روایات ملتی ہیں۔ ایک روایت کے مطابق، چونکہ وہ سائیکلوں کی مرمت کے ماہر کاریگر تھے اور ہندوستان میں ہنرمند کاریگروں کو اُستاد کہنے کا عام رواج تھا، اِسی سبب اُنہیں بھی اُستاد کہہ کر مخاطب کیا جانے لگا۔ دوسری روایت کے مطابق، قمر جلالوی کم عمری ہی سے بہت سے نوآموز شاعروں کے کلام کی اِصلاح کرنے لگے تھے، چنانچہ اِصلاحِ سخن میں اُن کی مہارت کے باعث اُنہیں اُستاد کہا جانے لگا۔

ممکن ہے دونوں روایات اپنی اپنی جگہ درست ہوں اور سائیکلوں کے کاریگر کی حیثیت سے قمر جلالوی کو ملنے والا اُستاد کا لقب، شاعری میں اُن کی اُستادی کے سبب، مستقل طور پر اُن کے نام کا حصہ بن گیا ہو۔ اُن کی اُستادی کا اعتراف صرف نوآموز شعراء تک محدود نہ تھا، بلکہ اُن کے معاصر اور عمر میں بڑے شعراء بھی اُنہیں اُستاد کہتے تھے۔ یہاں تک کہ جوش ملیح آبادی جیسے نامور شاعر بھی انہیں اُستاد ہی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ ہندوستان اور پاکستان، دونوں ملکوں میں اُن کے شاگردوں کی بڑی تعداد تھی؛ اعجاز رحمانی، پرنم الہ آبادی، فنا بلند شہری اور فضا جلالوی سمیت کئی نامور شعراء اُن کے حلقۂ تلامذہ میں شامل تھے۔

1947ء میں تقسیمِ ہند کے بعد اُستاد قمر جلالوی نے اپنے اہل و عیال کے ساتھ ہجرت کر کے کراچی میں سکونت اختیار کر لی۔ ہندوستان کی طرح یہاں بھی سائیکلوں کی مرمت کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا۔ بعض سوانحی حوالوں کے مطابق، وہ پاکستان کوارٹرز میں سائیکلوں کی مرمت اور پنکچر لگانے کی دکان چلاتے تھے، جبکہ ایک دوسری روایت، جو معروف صدا کار اور آوازوں کے محافظ لطف اللہ خان سے منسوب ہے، اُن کی دکان کا مقام لالو کھیت (لیاقت آباد) بتاتی ہے۔

اِس روایت کے مطابق، تین ہٹی سے لالو کھیت جاتے ہوئے ایک نمبر چورنگی سے پہلے دائیں جانب واقع جامع مسجد کی نکّی میں، جہاں آج کل دکانوں کی قطار ہے، اُن کی سائیکلوں کی مرمت کی دکان ہوا کرتی تھی۔

اُستاد قمر جلالوی کی زندگی سے متعلق ایک دلچسپ روایت یہ ہے کہ وہ دن بھر سائیکلوں کے پنکچر لگاتے اور مرمت کرتے رہتے، لیکن شعر و سخن کا سلسلہ اِس دوران بھی جاری رہتا۔ کام کرتے ہوئے جب کوئی شعر ذہن میں آتا تو فوراً کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھ لیتے اور اُسے دکان کی دیوار پر لگے سائیکل کے تار میں پرو دیتے۔ یوں سائیکلوں کے پرزوں، اوزاروں اور پنکچر لگانے کے سامان کے درمیان اُن کے تازہ اشعار بھی جمع ہوتے رہتے تھے۔

شام ہوتے ہی شاگردِ اصلاحِ سخن کے لیے جمع ہو جاتے یا کسی مشاعرے کے منتظمین کی طرف سے گاڑی آ جاتی تو اُستاد دکان کا کام سمیٹ کر مشاعرے میں شرکت کے لیے روانہ ہو جاتے۔ دن بھر سائیکلوں کے پنکچر لگانے والا یہ شخص شام کو اپنے عہد کے بڑے بڑے شعراء کے درمیان بیٹھ کر مخصوص ترنم، سوز و گداز اور زبان کی سلاست سے مشاعرہ لوٹ لیا کرتا تھا۔

کراچی میں ادبی شہرت اور مشاعروں میں مقبولیت کے باوجود اُستاد قمر جلالوی کے معاشی حالات زیادہ بہتر نہ ہو سکے۔ اُن کی زندگی سے متعلق ایک معروف روایت ہے کہ جب ممتاز عالم اور خطیب علامہ رشید ترابی کو معلوم ہوا کہ قمر جلالوی جیسا صاحبِ کمال شاعر کراچی میں سائیکلوں کے پنکچر لگا کر روزی کما رہا ہے تو انہوں نے اُستاد کو اپنے پاس بلایا، اُن کی سرپرستی کی اور حکومتِ پاکستان سے اُن کے لیے وظیفہ مقرر کرانے کی کوشش کی۔

چنانچہ 1959ء میں حکومتِ پاکستان کی جانب سے اُن کی ادبی خدمات کے اِعتراف میں ڈیڑھ سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر ہوا، جو اُنہیں تاحیات ملتا رہا۔ سائیکلوں کی مرمت سے ہونے والی آمدنی اور مشاعروں سے ملنے والا اِعزازیہ بھی اُن کے معاش کے ذرائع تھے۔ قمر جلالوی نہایت خوددار اور سادہ طبیعت کے مالک تھے۔ معاشی تنگ دستی کے باوجود کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے سے گریز کرتے اور اپنے ہنر کی کمائی سے زندگی گزارنے کو ترجیح دیتے تھے۔ یہی خودداری اُن کی شخصیت کا ایک نمایاں وصف تھا، جو اُن کی شاعرانہ عظمت کے ساتھ زندگی بھر وابستہ رہا۔

اُستاد قمر جلالوی کی شہرت کا ایک بڑا سبب اُن کا کلام پڑھنے کا مخصوص انداز بھی تھا۔ اُن کی آواز میں قدرتی طور پر درد اور کرب کی کیفیت موجود تھی اور وہ اپنے اشعار ایسے ترنم سے سناتے کہ سامعین پر گہرا اثر ہوتا۔ اُن کی شاعری میں مشکل الفاظ کی نمائش نہیں تھی۔ وہ نہایت سادہ انداز میں کوئی ایسی بات کہہ جاتے جو سننے والوں کے دل میں اُتر جاتی۔

اُن کی قادر الکلامی کا انداز اِس سے بھی ہوتا ہے کہ وہ مختصر اور طویل، دونوں طرح کی بحروں میں نہایت خوبی سے مضامین باندھتے تھے۔ غزل کی کلاسیکی روایت پر اُن کی گرفت ایسی تھی کہ معمولی بات کو بھی محاورے اور حسنِ بیان سے شعر بنا دیتے تھے۔ اُن کے معاصرین نے اُنہیں مشاعروں کی جان قرار دیا ہے۔

اُس زمانے میں جب جگر مراد آبادی، حسرت موہانی اور فیض احمد فیض جیسے نامور شعراء مشاعروں میں شریک ہوتے تھے، قمر جلالوی بھی اپنے مخصوص اندازِ بیان سے سامعین کی توجہ حاصل کرتے تھے۔ جوش ملیح آبادی جیسے شاعر بھی اُن کی اُستادی کے معترف تھے۔

اُستاد قمر جلالوی کے کلام کی مقبولیت صرف مشاعروں تک محدود نہ رہی۔ اُن کی غزلوں میں ایسی سلاست، موسیقیت اور جذبے کی شدت موجود تھی کہ برِ صغیر کے نامور گلوکاروں نے انہیں اپنی آواز دی۔ خصوصاً مُنی بیگم نے اُن کی متعدد غزلیں گا کر بے پناہ شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ "کب میرا نشیمن اہلِ چمن گلشن میں گوارا کرتے ہیں"، مریضِ محبت اُنہی کا فسانہ سناتا رہا۔ "ہم مے نشیں چل کہیں اور چل، اِس چمن میں اب اپنا گزارہ نہیں" اور "کبھی کہا نہ کسی سے ترے فسانے کو" اُن کی آواز میں محفوظ ہونے والی معروف غزلوں میں شامل ہیں۔

مُنی بیگم کے علاوہ حبیب ولی محمد نے "کب میرا نشیمن اہلِ چمن گلشن میں گوارا کرتے ہیں"، "مہدی حسن نے "کبھی کہا نہ کسی سے ترے فسانے کو"، "غلام علی نے "کبھی کہا نہ کسی سے ترے فسانے کو" اور مریضِ محبت اُنہی کا فسانہ" جبکہ عابدہ پروین نے "مرا خاموش رہ کر بھی اُنہیں سب کچھ سنا دینا" کو اپنی آواز دی۔ ملکۂ ترنم نور جہاں نے بھی "کبھی کہا نہ کسی سے ترے فسانے کو" گائی۔

قوالوں میں اُستاد نصرت فتح علی خان نے اُن کی طرف سے "ترکِ ملاقات ہو گئی" اور "نہ رکتے ہیں آنسو نہ تھمتے ہیں نالے" جیسے کلام کو اپنی پُرتاثیر آواز میں پیش کیا، جبکہ صابری برادران نے "آئے ہیں وہ مزار پہ" کو قوالی کی صورت میں گایا۔

اِن سبھی نامور فنکاروں کی آوازوں میں اُستاد قمر جلالوی کا کلام پاکستان سمیت دنیا کے دیگر ممالک کی محافلِ موسیقی میں بار بار سنا گیا اور آج بھی اِس کی فرمائش ہوتی ہے۔ تاہم بعض اہلِ قلم نے اِس بات پر افسوس کا اِظہار کیا ہے کہ قمر جلالوی زندگی بھر معاشی مشکلات سے دوچار رہے، جبکہ اُن کا کلام گانے والے فنکاروں کو اِسی شاعری سے شہرت اور آمدنی حاصل ہوتی رہی۔ البتہ اِس حقیقت سے اِنکار نہیں کیا جا سکتا کہ غزل گائیکوں کی آوازوں نے اُن کے کلام کو نئی نسلوں تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔

اُستاد قمر جلالوی کی شہرت بنیادی طور پر غزل گو شاعر کی حیثیت سے ہوئی، لیکن اُن کے شعری سرمائے کا ایک نمایاں حصہ نعتیہ شاعری، عقیدتِ رسولؐ اور اہلِ بیتِ علیہم السلام سے محبت و مودت کے اِظہار پر بھی مشتمل ہے۔ اُنہوں نے حمد، نعت، منقبت، سلام، نوحہ اور مرثیہ جیسی اصنافِ سخن میں بھی اپنی قادر الکلامی کے جوہر دکھائے۔

اُن کے نعتیہ کلام میں عقیدت و احترام، جذبے کی سچائی اور بیان کی سلاست نمایاں ہے۔ وہ حضورِ اکرمؐ سے اپنی والہانہ محبت کا اِظہار کرتے ہوئے مشکل تراکیب اور غیر ضروری لفظی آرائش کے بجائے سادہ، شائستہ اور مؤثر زبان کو ترجیح دیتے تھے۔ محاورے کی چستگی، الفاظ کی موزونیت اور جذبات کی اثر آفرینی اُن کی نعتیہ شاعری کے نمایاں محاسن ہیں۔ اُن کے شاگردوں میں معروف نعت گو شاعر اعجاز رحمانی بھی شامل تھے، جنہوں نے بعد میں اُردو نعتیہ شاعری میں اپنی الگ شناخت قائم کی۔

اُستاد قمر جلالوی کی شاعری کا ایک اہم اور قابلِ توجہ پہلو اہلِ بیت علیہم السلام سے اُن کی گہری محبت، عقیدت اور مودت بھی ہے۔ اُنہوں نے اہلِ بیتِ اطہار کے فضائل و مناقب، اُن کی سیرت و کردار اور بالخصوص واقعۂ کربلا کے مصائب و آلام کو نہایت سوز و گداز کے ساتھ اپنے کلام کا موضوع بنایا۔ اُن کے ہاں اہلِ بیت سے محبت محض رسمی عقیدت تک محدود نہیں رہتی، بلکہ ایک گہرے جذباتی اور روحانی وابستگی کے ساتھ سامنے آتی ہے۔

قمر جلالوی کو مرثیہ نگاری میں بھی غیر معمولی مہارت حاصل تھی۔ اُن کی مرثیہ نگاری محض کسی غزل گو شاعر کی دوسری صنف میں طبع آزمائی نہیں تھی، بلکہ اُنہوں نے باقاعدہ مرثیے، سلام اور نوحے کہے۔ اُن کے مرثیوں میں واقعۂ کربلا کے کرداروں، اُن کی قربانیوں، مصائب اور جاں نثاری کے واقعات کو نہایت دردمندی اور جذباتی تاثیر کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ واقعۂ کربلا کے مختلف مناظر اور کرداروں کی کیفیات بیان کرتے ہوئے اُن کی زبان میں سوز و گداز کے ساتھ ایک خاص وقار بھی محسوس ہوتا ہے۔

مرثیہ نگاری کی کلاسیکی روایت میں جس شان و شوکت، فصاحت، تشبیہات و اِستعارات، منظر نگاری اور واقعات کے تسلسل کو اہمیت حاصل ہے، قمر جلالوی کے مرثیوں میں بھی اُن خصوصیات کا اِظہار ملتا ہے۔ اُن کا ایک مرثیہ "خواب میں حضرت زہرا کو جو حرنے دیکھا" خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہے۔ جنابِ حر کے احوال پر مشتمل اِس مرثیے کا اِفتتاحیہ صفحات پر مشتمل ایک الگ مطبوعہ نسخہ بھی محفوظ ہے۔

اُستاد قمر جلالوی اُن شعراء میں شامل ہیں جن کی غیر معمولی شہرت اور طویل شاعرانہ زندگی کے باوجود اُن کا کوئی باقاعدہ مجموعۂ کلام اُن کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ وہ اپنے کلام کی اِشاعت اور تشہیر میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔

اُن کی غزلیں مشاعروں میں پڑھی جاتیں، شاگردوں اور مداحوں کے پاس نقل ہوتی رہتیں اور بعض اوقات اُن کے ہاتھ سے نکل کر دوسروں تک پہنچ جاتیں۔ اِسی وجہ سے اُن کے مکمل کلام کو جمع کرنا بھی آسان نہ تھا۔

اُستاد قمر جلالوی کی وفات کے بعد اُن کی صاحبزادی کنیز جلالوی اور دوسرے قدر دانوں نے اُن کے کلام کو یکجا کرنے کی کوشش کی۔ اِس کے نتیجے میں

رشکِ قمر (1977)
اوجِ قمر (1977)
غمِ جاوداں (1978ء کے مشترکہ نسخے میں)
عقیدتِ جاوداں (سن اِشاعت غیر متعین)
اور روحِ قمر (سن اِشاعت غیر متعین)

جیسے مجموعے سامنے آئے۔ تجلیاتِ قمر کا عنوان بھی اُن کے مطبوعہ کلام کے حوالے سے ملتا ہے۔

عقیدتِ جاوداں میں حمد، نعت اور مناقبہ جبکہ غمِ جاوداں میں سلام اور مراثی کو جمع کیا گیا ہے۔

اُستاد قمر جلالوی کے چار مجموعوں کو یکجا کر کے علی شاعر نے کلیاتِ قمر جلالوی کے عنوان سے بھی شائع کرایا ہے۔ گیارہ سو بیس صفحات پر مشتمل اِس کلیات میں اُن کی غزلیات، قطعات، حمد، نعت، مناقب، سلام اور مراثی کو جمع کیا گیا ہے۔ یوں جس شاعر کا کوئی مجموعہ اُس کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا، اُس کا کلام بعد میں ایک ضخیم کلیات کی صورت میں اُردو ادب کا حصہ بن گیا۔

اُستاد قمر جلالوی کی ملک گیر مقبولیت میں ریڈیو پاکستان نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ اِس ادارے کے پہلے ڈائریکٹر جنرل زیڈ اے بخاری نے اپنی ذاتی نگرانی میں اُن کی غزلیات، مرثیے اور نوحے ریڈیو پاکستان کراچی سے نشر کروائے۔ ریڈیو پاکستان کراچی کے ریڈیائی مشاعروں میں بھی اُنہیں باقاعدگی سے مدعو کیا جاتا تھا۔ ریڈیو پاکستان کے آرکائیو میں اُن کی اپنی آواز میں پڑھا ہوا کلام بھی صوتی ریکارڈ نگز کی صورت میں محفوظ ہے۔

کراچی کی ایک ادب دوست شخصیت عبدالرزاق گلبرگوی نے اُن کے بارے میں ایک چشم دید واقعہ محفوظ کیا ہے: 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد ریڈیو پاکستان کراچی نے اپنے سامنے واقع جمشید ہال میں ایک مشاعرہ منعقد کیا۔ عبدالرزاق گلبرگوی کے مطابق، اُن کے پاس اِلسٹریٹڈ ویکلی آف پاکستان کا ایک شمارہ تھا، جس کے سرورق پر اُستاد قمر جلالوی کی تصویر شائع ہوئی تھی۔ تصویر میں اُستاد اچکن پہنے مائیکروفون کے سامنے اپنا کلام سنا رہے تھے۔ عبدالرزاق گلبرگوی نے وہ رسالہ اُستاد کی خدمت میں پیش کیا اور درخواست کی کہ وہ اپنی تصویر پر دستخط کر دیں۔

اُستاد نے تصویر دیکھی، مگر فوراً دستخط کرنے کے بجائے چند لمحے فکرِ سخن میں مصروف ہو گئے۔ پھر رسالے پر فی البدیہہ یہ شعر لکھ دیا:

بہت تھی آرزو تم کو کلام سننے کی
قمر کو پڑھتے ہوئے آج تم نے دیکھ لیا

اِس کے بعد اُنہوں نے اپنے دستخط ثبت کر دیے۔ یہ واقعہ نہ صرف اُستاد قمر جلالوی کی حاضر دماغی اور برجستہ گوئی کی مثال ہے بلکہ اُس دور کے ریڈیائی مشاعروں اور ادبی ماحول کی ایک خوب صورت یادگار بھی ہے۔

اواخر عمری میں اُستاد قمر جلالوی پر فالج کے مرض میں مبتلا ہوئے اور اِسی بیماری کے سبب 24 اکتوبر 1968ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ اُنہیں کراچی کے علی باغ قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ اُن کی لوحِ مزار پر اُنہی کا اپنا یہ شعر کندہ ہے:

ابھی باقی ہیں پتوں پر چلے تنکوں کی تحریریں
یہ وہ تاریخ ہے، بجلی گری تھی جب گلستاں پر

اُستاد قمر جلالوی کو اِس دنیا سے رخصت ہوئے نصف صدی سے زائد عرصہ گزر چکا ہے، لیکن وہ اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں آج بھی زندہ ہیں۔ اُن کا کلام، زبان کی سلاست، سوز و گداز اور مخصوص ترنم کے سبب آج بھی اُردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہے اور آنے والی نسلوں کو اُن کی یاد دلاتا رہے گا۔

ریڈیو پاکستان اُردو کے اِس عظیم شاعر کو اُن کی 58ویں برسی پر خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔

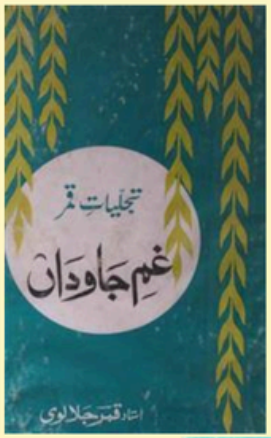

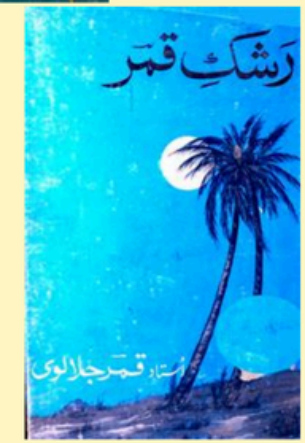

افسانہ

جنت آباد

تحریر:۔ ڈاکٹر عبد المالک بلوچ



جلال کے آباؤ اجداد زمانہ ہوئے جنت آباد میں آباد تھے۔ جنت آباد کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہوگا کہ یہ شہر کب اور کس صدی میں آباد ہوا۔ تاہم اِس شہر میں موجود قدیم مقبرے اور قلعہ اِس شہر کی تاریخی اہمیت کو مسلمہ بناتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اِس شہر کا محلِ وقوع بھی شاندار ہے جس کی وجہ یہاں کا طویل نخلستان ہے۔ یہ نخلستان نہ صرف شہر کی خوب صورتی کو جلا بخشتا ہے بلکہ یہ جنت آباد کے باسیوں کی معاش کا مستند ذریعہ بھی ہے۔ جس طرح اِس شہر کی تاریخ پرانی ہے، اِسی طرح اِس خاندان کی سکونت بھی قدیم طور پر یہاں سے وابستہ رہی ہے۔ جلال کو ایک عرصہ ہوا تھا کہ وہ دیارِ غیر میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ چند دن ہوئے کہ وہ اپنے آبائی شہر جنت آباد میں لوٹ آیا تھا۔ جلال کے نزدیک جنت آباد کسی بھی جنت سے کم نہیں لیکن اب جنت آباد کی ہر شے تبدیل ہو کر رہ گئی تھی۔

ایک دن جلال اپنے گھر سے نکل کر وہ مقامات دیکھنے چلا گیا جہاں اُس نے اپنے بچپن کے دن گزارے تھے۔

چلتے چلتے جلال اُس درخت کے نیچے پہنچا جہاں وہ کھجور چُن کر کھایا کرتا اور پرندوں کا شکار بھی کرتا تھا۔ جلال اپنی لاٹھی ٹیکتا اُس کھیت میں بھی پہنچا جہاں کبھی چاول کی فصل کاشت کی جاتی تھی۔ جب جلال کو پیاس لگتی تو وہ چاول کی فصل میں دیئے گئے پانی سے اپنی پیاس بجھاتا۔ اِس خدشے سے بے خبر کہ اِس سے کہیں اُسے یرقان یا اور کوئی موذی مرض لاحق نہ ہو جائے۔

جلال چلتے چلتے ندی کے اوپر قائم ایک ٹیلے پر بیٹھ گیا اور خیالات کے گھوڑے دوڑانے لگا۔ وہ سوچنے لگا، یہ ندی کتنی کشادہ ہو گئی ہے۔ پھر اُسے خیال آیا کہ اِس بات کو پچاس سال کا عرصہ بھی تو بیت چکا ہے۔ جلال کو جنت آباد میں آنے والا وہ بڑا سیلاب بھی یاد آیا جو شہو نامی کسان کی فصلیں بہا کر لے گیا تھا اور شہو بے بسی کی حالت میں سیلابی ریلے کے پانی پر اپنے پستول سے فائر تک کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالتا رہا۔

جلال نے ندی کی تہہ سے گوال کھجور کا وہ درخت بھی ڈھونڈ نکالا جو اُس کے دادا کے کھیتوں کی سرحد پر اُگایا گیا تھا اور اُس کے بارے میں مشہور تھا کہ اِس پر کسی جن کا بسیرا ہے۔ جلال اپنے بچپن کے دنوں میں اُس راستے پر بہت آیا جاتا کرتا تھا۔ اُس کی یہ خواہش بھی تھی کہ وہ جن کو دیکھ سکے لیکن وہ جن کو کبھی بھی نہیں دیکھ پاتا۔

جلال کو یہ سب دیکھ کر جو خوشی آج مل رہی تھی، وہ بے پایاں تھی۔ وہ خوشی کے مارے کبھی ہنس دیتا تو کبھی رو دیتا۔ یہ آنسو اُس کے جسم اور روح کو تسکین پہنچانے کا سبب بن رہے تھے۔

جلال کچھ دیر کے لیے پھر تاریخ کے درپچوں میں کھو گیا۔ اُسے وہ زمانہ بھی یاد آیا جب اسکول میں موسمِ گرما کی تعطیلات ہوا کرتی تھیں تو جنت آباد کے تمام لڑکے خوشی سے جھوم اُٹھتے کیونکہ اُنہیں اُن دنوں اسکول کے اُستاد کی سزا کے عذاب سے گلو خلاصی کا موقع مل جاتا۔

جنت آباد کے اسکول کے اُستادوں کے بارے مشہور تھا کہ اُن کو سزا کے علاوہ اور کوئی کام نہیں آتا تھا۔ بالخصوص راجہ عادل جو اِس شہر کے بااثر شخص کا بیٹا تھا، اسکول کے طالب علم اُس سے بہت خوف کھاتے تھے۔ جس دن اُستاد عادل سرخ رنگ کے چوٹ (Chawat) پہن کر اسکول آتا تھا تو کسی بھی طالب علم کی خیر نہیں ہوتی تھی۔ کسی سے غلطی ہو یا نہ ہو، وہ سب کو بہانے سے سزا دیتا۔

اسکول کی چھٹیوں کے دنوں میں جلال اپنے دوستوں کے ساتھ سارا دن نخلستان میں گھومتا پھرتا، جہاں وہ پرندے پکڑنے کی شرط لگاتا، کھجور پھنتا اور کھیل کود میں مگن رہتا۔ ندی کے گہرے پانیوں میں نہاتا اور شام ڈھلے گھر کی واپسی کی راہ لیتا۔ جنت آباد میں ایک اور بھی کوچہ تھا، جہاں بستی کی سب سے بڑی آبادی بستی تھی۔ اِس کوچے میں ایک ہوٹل بھی ہوا کرتا تھا جو وہاں کے ہائیڈ پارک کا درجہ رکھتا تھا۔ غریب ہو یا امیر، بڑی عمر کے لوگ ہوں یا چھوٹی عمر کے، سب اُس ہوٹل کا رخ ضرور کرتے، جہاں وہ بیٹھ کر بی بی سی اُردو سروس کی نشریات سنتے۔

کسان مزری کے پتوں سے رسی اور ٹوکری بناتے تھے۔ نوجوان طبقہ محمد رفیع اور لتا کے گانوں کے فرمائش کر کے دودھ پتی چائے کا چسکا اُٹھاتے نظر آتے۔ اگر کسی کو واجہ قادر کے ہوٹل کے منکے کا سرد پانی مہیا کیا جاتا تو وہ وہاں کا خاص بندہ گردانا جاتا تھا۔ لیپو نامی شخص اُس ہوٹل کا بیرا تھا۔ کبھی کبھار ہوٹل میں رش بھی ہوا کرتا تھا لیکن لیپو جس پھرتی اور تیزی سے چائے پیش کرتا تھا، اِس سے یہ گمان ہوتا تھا کہ ہوٹل میں گاہکوں کا رش بڑھ گیا ہے۔

لیپو کو نوجوان سے بڑی انسیت تھی۔ ہوٹل میں جب آتا تو لیپو اُس کو مفت میں چائے پیش کرتا، منکے کا سرد پانی بھی پلاتا اور گانوں کی فرمائشیں بھی بلا تاخیر پورا کرتا۔

جنت آباد میں شاعر اور لیڈر بھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔ ہر قسم کے کھیل بھی یہاں ہوا کرتے تھے جس سے یہ گمان کیا جاتا تھا کہ یہ سب کھیل اِس شہر کی اپنی ایجاد ہیں۔

موسمِ گرما کی راتوں میں جنت آباد میں روایتی و علاقائی کھیل سجائے جاتے۔ زمستان کی سرد راتوں میں قصہ گو لوگوں کو کہانیاں اور ضرب الامثال سناتے تھے۔ جنت آباد میں روحانی طریقے کا علاج بھی مشہور تھا۔ زینب نامی عورت کو اِس علاج کی ماں کہا جاتا تھا۔ اگر بیوی اور شوہر کے درمیان کوئی ناچاقی جنم لیتی اور بیوی کسی خواہش کی تکمیل چاہتی تو اُس کو زینب کے پاس لے جاتے تھے۔ پھر ساری رات دھمال کا اہتمام کیا جاتا۔

زینب کے ہاتھ میں ایک باریک لکڑی ہوا کرتی تھی۔ ورد کرتے ہوئے جب بھی وہ جوش و جلال میں آتی تو اِس لکڑی کو بیمار عورتوں کے سر پر مار کر سوال کرتی بتا تیری خواہش کیا ہے؟ وہ کہہ اُٹھتی کہ وہ سونا اور حلوہ چاہتی ہے۔ تو شوہر کی سمجھو شامت آئی۔ صبح جیسے تیسے شوہر اِن چیزوں کا بندوبست کرتا۔ اگر نہ کرتا تو وہ بستی والوں کی لعن طعن سے کسی بھی صورت بچ نہیں پاتا۔

جنت آباد میں گدھا گاڑی دوڑ بھی مشہور تھی۔ شہر کے زمینداروں کے پاس اعلیٰ نسل کے گدھے تھے۔ شام کے وقت شرط لگا کر وہ گدھوں کی دوڑ منعقد کرتے۔

بستی کے لوگوں کا ایک اور مشغلہ مرغے لڑانے کا بھی تھا۔ ہر اتوار کے دن دُور کھیتوں میں درختوں کے سائے میں مرغے لڑائے جاتے اور شائقین کا جم غفیر وہاں اُمنڈ آتا۔

جلال ایک ٹیلے پر بیٹھا ہوا ندی کے کنارے اُگے درختوں کا نظارہ کر رہا تھا اور اِس کوشش میں تھا کہ وہ ندی کے اُن مقامات کا کھوج لگائے جہاں وہ بچپن میں ندی کی ریتلی زمین پر بیٹھا کرتا تھا۔

جلال کو جنت آباد کی وہ دو کوچے بھی یاد آ رہے تھے جہاں شاعروں کی بھرمار ہوا کرتی تھی۔ جہاں شام کے اوقات میں وہ شاعری کی مجالس منعقد کر کے اپنا کلام سناتے مگر اُن کا کلام سننے والے اکثر قلیل تعداد میں ہوا کرتے تھے۔ کبھی کبھار یہ شاعر حضرات خود محفل سجا کر وہاں چائے وغیرہ کا بندوبست بھی کرتے تھے تاکہ بڑی تعداد میں لوگ آ کر اُن کا کلام سُنیں اور اُن کو داد دیں۔

جنت آباد میں ایک اور بھی کوچہ تھا جہاں خوب صورت جوتے تیار کیے جاتے تھے اور اُن جوتوں کو ہر طبقے کے لوگ بے حد پسند کرتے تھے۔

جلال کو اچانک جنت آباد کا ایک کردار نا کو باران بھی یاد آیا جو ہاتھ سے خوبصورت شال اور کپڑے بُننے کا ماہر تھا۔ بچپن میں جلال کے والد نے نا کو باران سے شال خرید کر جلال کو زیبِ تن کرنے کے لیے دی تھی۔ نا کو باران جب پیرانِ سالی کا شکار ہوا تو اُس نے اپنے ساز و سامان کو آگ لگا دی کیونکہ اُس کے بچوں نے اُس سے یہ ہنر نہیں سیکھا۔

جلال نے دیکھا کہ سورج ڈوب رہا ہے۔ وہ اپنے ماضی سے حال میں لوٹ آیا۔ ٹیلے سے اُٹھا، کپڑوں سے مٹی جھاڑ کر اپنے عصا کے سہارے چلنا شروع ہو گیا۔



ڈاکٹر عبد المالک بلوچ کا تعلق تُربت کیچ سے ہے۔ اُنہوں نے لکھنے کا آغاز مانہٗ طالب علمی سے کیا۔ اُنہوں نے تحریری سفر کا آغاز بلوچی مضمون نویسی سے کیا اور پھر چند افسانے بھی لکھے۔ اِس کے بعد سیاسی مصروفیا ت کے باعث ایک طویل تعطل رہا۔ بعد ازاں وہ بلوچستان کے وزیر اعلیٰ کے منصب پر فائز رہے، اس دوران اُنہوں نے اپنے کئی تجربات کو افسانوں کا حصہ بنایا۔ یوں اُن کا افسانوی تجربہ اور اِس کا زمان و مکان بلوچستان کے لگ بھگ نصف صدی کے سیاسی، سماجی منظر نامے کی عکاسی کرتا ہے۔ اُن کے یہ تمام افسانے بلوچی میں "مارشت "(احساسات)کے نام سے 2020ء میں کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ جنہیں گوادار سے تعلق رکھنے والے نوجوان صحافی اور لکھاری عبد الحلیم حیاتان نے اُردو کا روپ دیا ہے۔

بشکریہ پی بی سی کوئٹہ

اُردو انشائیہ: فن، فکر اور اسلوب کی دل نشیں دنیا

تحریر: سید عابس رضا کاظمی

ادب محض الفاظ کی ترتیب، خیالات کی ترسیل یا واقعات کی ترجمانی کا نام نہیں، بلکہ یہ انسانی احساسات، تجربات، مشاہدات اور باطنی کیفیات کے اظہار کا ایک ایسا وسیلہ ہے جس کے ذریعے زندگی اپنے مختلف رنگوں اور معنویت کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ اُردو نثر کی مختلف اصناف میں ہر صنف کا اپنا مزاج، اپنا اسلوب اور اپنی انفرادیت ہے۔ کہیں معلومات کی فراہمی بنیادی مقصد ہوتی ہے، کہیں استدلال اور تجزیے کو اہمیت حاصل ہوتی ہے، کہیں واقعات کی دل چسپی قاری کو اپنی گرفت میں لیتی ہے اور کہیں مصنف کے احساسات وتاثرات تحریر کو ایک ایسی دل آویزی عطا کرتے ہیں جو براہِ راست دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اُردو نثر کی اِسی رنگا رنگ دنیا میں انشائیہ ایک ایسی صنف ہے جو اپنی بے ساختگی، شگفتگی، لطافتِ اظہار اور انفرادی اندازِ فکر کے باعث ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔

انشائیہ بظاہر ایک سادہ اور بے تکلف تحریر محسوس ہوتا ہے، لیکن اِس سادگی کے پسِ منظر میں فکر کی گہرائی، مشاہدے کی وسعت، زبان پر قدرت اور اسلوب کی دل نشینی کارفرما ہوتی ہے۔ یہ وہ صنف ہے جس میں ایک معمولی سا واقعہ، روزمرہ زندگی کا کوئی عام سا منظر، کسی مانوس شے کا ذکر یا کسی انسانی عادت کا مشاہدہ ایک غیر معمولی ادبی تجربے میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ انشائیہ نگار کی اصل قوت یہی ہے کہ وہ عام چیزوں میں غیر معمولی معنویت تلاش کرتا ہے اور قاری کو زندگی کے ان پہلوؤں سے روشناس کراتا ہے جو بظاہر نگاہوں کے سامنے ہوتے ہیں، لیکن ہماری توجہ سے اوجھل رہتے ہیں۔

انشائیے کا مفہوم اور ماہیت:

لفظ "انشائیہ" کا تعلق انشا سے ہے، جس کے معنی تحریر، اظہار اور تصنیف کے ہیں۔ ادبی اصطلاح میں انشائیہ نثر کی ایسی صنف ہے جس میں مصنف کسی موضوع، خیال، تجربے یا مشاہدے کو اپنے ذاتی احساسات، آزادانہ فکر، شگفتہ اسلوب اور تخلیقی انداز میں پیش کرتا ہے۔ اِس میں موضوع کی پابندی سے زیادہ اظہار کی تازگی، فکر کی انفرادیت اور اسلوب کی دل کشی اہم ہوتی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی معروف تنقیدی کتاب انشائیہ کے خد و خال میں انشائیے کی صنفی شناخت اور اِس کے فنی امتیازات پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اِس کتاب کی اہمیت اِس اعتبار سے مسلم ہے کہ اِس میں انشائیے کی بے تکلفی، طنز و مزاح سے اِس کے تعلق، اصلاحی تحریر سے اِس کے فرق اور اِس کی مخصوص ادبی ہیئت جیسے سوالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ وزیر آغا کی تنقیدی کاوشوں نے اُردو انشائیے کو محض ایک عمومی نثری تحریر سمجھنے کے بجائے اِس کی الگ فنی شناخت کے تعین میں نمایاں کردار ادا کیا۔

انشائیے کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اِس میں مصنف محض کسی موضوع کی معلومات فراہم نہیں کرتا، بلکہ اِس موضوع کے حوالے سے اپنے باطنی ردِ عمل، ذہنی کیفیت اور شخصی زاویۂ نظر کو بھی تحریر کا حصہ بناتا ہے۔ یوں انشائیہ محض موضوع کا بیان نہیں رہتا، بلکہ مصنف کی شخصیت، اِس کے مزاج اور اِس کے طرزِ فکر کا آئینہ بن جاتا ہے۔

تاہم انشائیے کو محض بے ربط خیالات، غیر سنجیدہ گفتگو یا مزاحیہ تحریر سمجھنا درست نہیں۔ اِس میں فکری گہرائی بھی ہو سکتی ہے، فلسفیانہ تاثر بھی، سماجی شعور بھی اور انسانی نفسیات کی باریک بینی بھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ انشائیہ نگار اپنے خیالات کو کسی خشک علمی بحث یا باقاعدہ استدلالی نظام میں مقید کرنے کے بجائے تخلیقی آزادی اور ادبی لطافت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

اُردو انشائیے کی روایت اور ارتقاء:

اُردو انشائیے کی روایت کو سمجھنے کے لیے اُردو نثر کی تاریخ اور اِس کے ارتقائی مراحل کا مطالعہ ضروری ہے۔ اُردو نثر کی ابتدائی صورتوں میں داستان، مذہبی و اخلاقی تحریر، مکتوب نگاری، سفر نامہ اور اصلاحی مضامین نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ اِن اصناف میں انشائیہ نما عناصر ضرور موجود تھے، تاہم جدید مفہوم میں انشائیے کی الگ صنفی شناخت رفتہ رفتہ تشکیل پائی۔

اُنیسویں صدی میں اُردو نثر کی اصلاح، صحافت کے فروغ، جدید تعلیم کے پھیلاؤ اور نئے سماجی و فکری رجحانات نے نثر کو نئی جہتیں عطا کیں۔ اُس دور میں مضمون نگاری نے خاص طور پر ترقی کی اور اُردو نثر میں سادگی، شگفتگی، استدلال اور شخصی اظہار کے نئے امکانات پیدا ہوئے۔ سر سید احمد خان، مولانا حالی اور محمد حسین آزاد کی تحریروں نے اُردو نثر کے مزاج کو تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اُن کی تحریروں میں اصلاحی فکر، تنقیدی شعور، ادبی ذوق اور شخصی اظہار کی مختلف صورتیں سامنے آئیں۔ اگرچہ اِن تمام تحریروں کو جدید انشائیے کے زمرے میں شامل نہیں کیا جا سکتا، لیکن اِن کے ذریعے وہ نثری فضا ضرور ہموار ہوئی جس میں بعد کے انشائیے نے اپنی شناخت قائم کی۔

اُردو انشائیے کے تنقیدی ارتقا پر قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان کے شائع کردہ مطالعات میں اِس امر کی نشان دہی کی گئی ہے کہ جدید انشائیے کی تشکیل کو کسی ایک مصنف یا ایک تحریر تک محدود کرنا درست نہیں۔ خواجہ حسن نظامی، نیاز فتح پوری اور دیگر نثر نگاروں کی تحریروں میں انشائیہ نما عناصر کی موجودگی، نیز بیسویں صدی میں اِس صنف کے باقاعدہ تعارف اور فروغ کے مراحل، اِس کی تاریخ کو ایک وسیع تناظر میں دیکھنے کا تقاضا کرتے ہیں۔ (۲)

بیسویں صدی میں ڈاکٹر وزیر آغا نے اُردو انشائیے کے فنی مباحث کو منظم کرنے اور اِس کی صنفی شناخت کو نمایاں کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اُن کے انشائیوں کے مجموعے خیال پارے، چوری سے یاد کی تک اور دوسرا کنارا اِس حوالے سے قابلِ ذکر ہیں۔ اِن مجموعوں میں روزمرہ زندگی، انسانی رویوں اور عام تجربات کو تخلیقی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد اور محمد افضل بٹ کا تحقیقی مقالہ "وزیر آغا کی انشائیہ نگاری" بھی اِس ضمن میں اہم ہے۔ یہ مقالہ ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں کے بنیادی موضوعات اور اُن کی فنی خصوصیات کے مطالعے پر مشتمل ہے۔ اِس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وزیر آغا کی اہمیت محض انشائیہ لکھنے تک محدود نہیں، بلکہ اُنہوں نے اِس صنف کے فکری اور فنی امکانات کو سمجھنے اور سمجھانے میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ (۳)

انشائیہ اور مضمون: ایک فنی امتیاز:

اُردو ادب میں انشائیے اور مضمون کے درمیان فرق کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ عام گفتگو میں اکثر دونوں اصطلاحات ایک دوسرے کے متبادل کے طور پر استعمال ہوتی ہیں، لیکن فنی اعتبار سے اِن کے درمیان بنیادی فرق موجود ہے۔

مضمون میں عموماً کسی موضوع کی وضاحت، اِس کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ، معلومات کی فراہمی یا کسی خاص نقطۂ نظر کی تائید و تردید بنیادی مقصد ہو سکتا ہے۔ اِس کے برعکس انشائیے میں موضوع اکثر مصنف کے ذاتی مشاہدے اور احساس کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ یہاں موضوع سے زیادہ اہم وہ زاویہ نظر ہوتا ہے جس سے مصنف اسے دیکھتا اور پیش کرتا ہے۔

مثلاً وقت کی پابندی پر لکھا گیا ایک مضمون اِس کی اہمیت، فوائد، معاشرتی اثرات اور عملی تقاضوں پر گفتگو کر سکتا ہے، جبکہ اِسی موضوع پر لکھا گیا انشائیہ کسی ایسے شخص کے گرد تشکیل پا سکتا ہے جو ہر ملاقات میں دیر سے پہنچتا ہے اور اپنی تاخیر کے لیے نت نئی توجیہات تراشتا رہتا ہے۔ انشائیہ نگار اِس کردار کے ذریعے انسانی عادات، خود فریبی اور روزمرہ زندگی کی مضحکہ خیزی کو اِس انداز میں نمایاں کر سکتا ہے کہ قاری مسکراتے ہوئے اپنے معاشرے اور اپنی ذات پر بھی غور کرنے لگے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب انشائیہ کے خد و خال میں انشائیے اور دوسری نثری اصناف کے امتیازات پر گفتگو اِسی لیے اہم ہے کہ اِس صنف کی پہچان محض موضوع کے انتخاب سے نہیں، بلکہ اسلوب، شخصی اظہار اور فکر کی پیش کش سے قائم ہوتی ہے۔

انشائیے میں فکر موجود ہوتی ہے، لیکن وہ عموماً کسی باقاعدہ مقدمے اور نتیجے کی صورت میں سامنے نہیں آتی۔ اِس کا مفہوم اکثر اشاروں، تلمیحات، لطیف مشاہدات اور اسلوبیاتی نزاکت کے ذریعے آشکار ہوتا ہے۔

انشائیے کی فنی خصوصیات

انشائیے کی انفرادیت چند بنیادی فنی خصوصیات سے عبارت ہے، جن میں شخصی رنگ، بے ساختگی، شگفتگی، تخلیقی آزادی، مشاہدے کی گہرائی اور زبان و بیان کی دل نشینی نمایاں ہیں۔

شخصی رنگ اور انفرادیت: انشائیہ نگار کی شخصیت اُس کی تحریر میں نمایاں ہوتی ہے۔ اُس کے خیالات، احساسات، پسند و ناپسند، مزاج اور مشاہدے کا انداز تحریر کو ایک خاص شناخت عطا کرتے ہیں۔ ایک ہی موضوع پر مختلف انشائیہ نگار لکھیں تو اُن کی تحریروں میں فرق صرف الفاظ کا نہیں، بلکہ زاویۂ نظر اور شخصیت کا بھی ہوتا ہے۔

بے ساختگی اور روانی: انشائیہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مصنف قاری کے ساتھ بیٹھ کر گفتگو کر رہا ہو۔ اِس میں غیر ضروری تکلف، مصنوعی سنجیدگی اور ثقیل عبارت آرائی سے گریز کیا جاتا ہے۔ تاہم بے ساختگی کا مطلب بے احتیاطی نہیں؛ ایک اچھا انشائیہ نگار اپنی تحریر کو اِس مہارت سے ترتیب دیتا ہے کہ اِس کی فنی ساخت پسِ منظر میں رہتے ہوئے بھی پوری طرح مؤثر ہوتی ہے۔

شگفتگی اور لطافت: انشائیے میں مزاح، ظرافت اور ہلکی سی شوخی کو خاص اہمیت حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ شگفتگی محض ہنسانے کے لیے نہیں ہوتی، بلکہ انسانی رویوں کی پیچیدگیوں کو اُجاگر کرنے کا وسیلہ بھی بنتی ہے۔ کبھی ایک معمولی سا جملہ معاشرتی تضاد کو نمایاں کر دیتا ہے اور کبھی ایک لطیف اشارہ زندگی کے کسی گہرے تجربے کو روشن کر دیتا ہے۔

مشاہدے کی گہرائی: انشائیہ نگار کی نگاہ عام لوگوں سے مختلف ہوتی ہے۔ وہ روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے معمولی واقعات سے ایسے معنی کشید کرتا ہے جن پر عام طور پر غور نہیں کیا جاتا۔ بازار کی رونق، بارش کی آواز، کسی پرانی کتاب کی خوشبو، دوستوں کی محفل یا کسی انسان کی خاموشی، ہر چیز اُس کے لیے ایک ممکنہ ادبی موضوع بن سکتی ہے۔

تخلیقی آزادی: انشائیے میں مصنف کو اپنے خیالات اور تاثرات کی پیش کش میں نسبتاً زیادہ آزادی حاصل ہوتی ہے۔ وہ ایک خیال سے دوسرے خیال کی طرف منتقل ہو سکتا ہے، کسی ذاتی تجربے کو یاد کر سکتا ہے، کسی منظر کی تصویر کشی کر سکتا ہے اور پھر اِسی تجربے سے ایک وسیع تر انسانی حقیقت تک پہنچ سکتا ہے۔ تاہم یہ آزادی بے ربطی کا نام نہیں؛ ایک اچھے انشائیے میں داخلی ربط اور اسلوبی وحدت ضرور موجود ہوتی ہے۔

زبان و بیان کی دل کشی: انشائیے کی کامیابی میں زبان بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ الفاظ کا مناسب انتخاب، جملوں کی موزونیت، تشبیہات و استعارات کا بر محل استعمال اور عبارت کی روانی تحریر کو مؤثر بناتے ہیں۔ انشائیہ نگار کے لیے زبان محض خیالات کی ترسیل کا ذریعہ نہیں، بلکہ فن اظہار کا ایک بنیادی وسیلہ ہوتی ہے۔

اِن خصوصیات کی عملی تفہیم کے لیے ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں کے ساتھ ساتھ انور سدید، مشکور حسین یاد اور رشید امجد کی انشائیے سے متعلق تنقیدی تحریروں کا مطالعہ بھی مفید ہے۔ ڈاکٹر محمد اسد اللہ کی مرتب کردہ کتاب یہ ہے انشائیہ میں انشائیے کے فن اور تنقید پر متعدد اہلِ قلم کی تحریریں یکجا کی گئی ہیں، جن میں وزیر آغا کا مضمون "اردو انشائیہ کی کہانی" اور دیگر ناقدین کی متعلقہ تحریریں شامل ہیں۔ یہ مجموعہ اِس صنف کے مختلف تنقیدی زاویوں سے واقفیت کا ایک مفید ذریعہ ہے۔

انشائیہ اور مزاح کا تعلق:

انشائیے کا مزاح سے گہرا تعلق ضرور ہے، لیکن دونوں کو ایک ہی صنف قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مزاحیہ تحریر کا بنیادی مقصد عموماً ہنسانا، مسکراہٹ پیدا کرنا یا انسانی کمزوریوں کو شگفتہ انداز میں پیش کرنا ہوتا ہے، جب کہ انشائیے میں مزاح کے ساتھ فکری تاثر، ذاتی مشاہدہ، جمالیاتی کیفیت اور آزادانہ اظہار بھی اہم ہو سکتے ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی کی کتابیں چراغ تلے، خاکم بدہن اور آبِ گم اردو طنز و مزاح اور نثر کی اس روایت کی اہم مثالیں ہیں جس میں زبان کی شگفتگی، تہذیبی شعور اور انسانی رویوں کا باریک مشاہدہ نمایاں ہے۔ تاہم یوسفی کی ہر تحریر کو انشائیہ قرار دینا درست نہیں؛ اُن کی ادبی اہمیت کو سمجھنے کے لیے طنز و مزاح، مضمون اور انشائیے کے فنی فرق کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

اِسی طرح شفیق الرحمٰن کی تحریروں میں لطافت، شگفتگی اور انسانی جذبات کی دل نشین عکاسی ملتی ہے۔ اِن لکھنے والوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شگفتہ نثر کی تاثیر محض لطیفے یا برجستہ جملے سے پیدا نہیں ہوتی، بلکہ اِس کے پیچھے زبان پر قدرت، انسانی نفسیات کی آگاہی اور تخلیقی بصیرت بھی کارفرما ہوتی ہے۔

ایک اچھا انشائیہ قاری کو ہنسا بھی سکتا ہے اور اُسے سوچنے پر بھی مجبور کر سکتا ہے۔ اُس کی شگفتگی کے پیچھے زندگی کی کوئی تلخ حقیقت، انسانی نفسیات کا کوئی پیچیدہ پہلو یا معاشرتی رویے کا کوئی تضاد پوشیدہ ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انشائیے کا مزاح محض ظاہری خوش طبعی تک محدود نہیں رہتا، بلکہ بعض اوقات گہرے انسانی شعور کا مظہر بن جاتا ہے۔

انشائیہ نگار: ایک حساس مشاہدہ کرنے والا ذہن:

انشائیہ نگار کی اصل شناخت اِس کی حساسیت اور مشاہدے کی قوت سے ہوتی ہے۔ وہ زندگی کے واقعات کو محض دیکھتا نہیں، بلکہ اُن کے اندر پوشیدہ معنویت کو محسوس بھی کرتا ہے۔ عام آدمی کسی واقعے سے گزر کر آگے بڑھ جاتا ہے، لیکن انشائیہ نگار اسی واقعے میں ایک خیال، ایک سوال یا ایک ادبی تجربے کی بنیاد تلاش کر لیتا ہے۔

اُس کے لیے کوئی موضوع چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا۔ وہ ایک ٹوٹی ہوئی کرسی، پرانے جوتے، خالی کمرے، مصروف بازار، بے مقصد بحث یا خاموش بیٹھے ہوئے شخص سے بھی ایک بامعنی تحریر تخلیق کر سکتا ہے۔ اُس کی نگاہ اشیاء کے ظاہری وجود سے آگے بڑھ کر اُن کے ساتھ وابستہ انسانی تجربات اور جذبات تک پہنچتی ہے۔

یہی حساسیت انشائیے کو زندگی سے قریب رکھتی ہے۔ انشائیہ نگار نہ تو زندگی سے مکمل طور پر لاتعلق رہ سکتا ہے اور نہ ہی اُسے محض نظریاتی تصورات میں محدود کر سکتا ہے۔ وہ زندگی کی خوشیوں، محرومیوں، تضادات، اُمیدوں اور اُلجھنوں کو اپنے مخصوص انداز میں محسوس کرتا ہے اور انہیں ایسی زبان عطا کرتا ہے جس سے قاری اپنے تجربات کی بازگشت سن سکتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں کے موضوعاتی مطالعے میں بھی روزمرہ تجربات اور مناظر سے تخلیقی معنویت اخذ کرنے کی اہمیت سامنے آتی ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد اور محمد افضل بٹ کا تحقیقی مقالہ اِس پہلو کو سمجھنے کے لیے ایک قابلِ رجوع مطالعہ ہے۔

انشائیے کی تہذیبی اور سماجی معنویت:

ادب کا ایک اہم وظیفہ اپنے عہد کی تہذیبی زندگی کو محفوظ کرنا اور اُس کے رویوں کی تفہیم میں مدد دینا ہے۔ انشائیہ بھی اِس اعتبار سے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ اِس میں روزمرہ زندگی کی عادات، انسانی تعلقات، معاشرتی رویے، بدلتے ہوئے ذوق، زبان کے رجحانات اور تہذیبی تبدیلیوں کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔

انشائیہ نگار اپنے معاشرے کو کسی خطیب کی طرح براہِ راست نصیحت نہیں کرتا، بلکہ کبھی مسکراہٹ،

کبھی حیرت، کبھی تاسف اور کبھی محبت کے ذریعے اِس کی تصویر پیش کرتا ہے۔ وہ انسانی کمزوریوں کو نمایاں کرتے ہوئے بھی انسان سے اپنا تعلق برقرار رکھتا ہے۔ اُس کی تنقید میں اکثر ایک ایسی نرمی ہوتی ہے جو قاری کو دفاعی رویہ اختیار کرنے کے بجائے خود احتسابی کی طرف مائل کرتی ہے۔

معاشرتی زندگی میں دکھاوے، مصنوعی طرزِ عمل، بے جا تکلف، خود پسندی، غیر ضروری مصروفیت اور ظاہری کامیابی کی دوڑ جیسے موضوعات انشائیے کے لیے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اِن موضوعات کو محض شکایت یا وعظ کے انداز میں پیش کرنے کے بجائے ایک تخلیقی اور شگفتہ پیرائے میں بیان کیا جائے تو وہ زیادہ دیر پا اثر پیدا کر سکتے ہیں۔

اِس اعتبار سے انشائیہ معاشرے کا ایسا آئینہ ہے جس میں صرف چہرے ہی نہیں، رویے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ البتہ اِس آئینے کی خاص بات یہ ہے کہ اِس میں تصویر کے ساتھ مصنف کی اپنی شخصیت کا عکس بھی شامل ہوتا ہے۔

عصرِ حاضر میں اُردو انشائیے کے امکانات:

موجودہ دور میں انسانی زندگی کی رفتار تیز ہو چکی ہے۔ سوشل میڈیا، ڈیجیٹل ذرائع ابلاغ، مصنوعی ذہانت، بدلتے ہوئے معاشرتی تعلقات اور معلومات کی فراوانی نے انسان کے طرزِ فکر اور اندازِ اظہار پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ ایسے ماحول میں انشائیے کی اہمیت کم ہونے کے بجائے نئے امکانات کے ساتھ سامنے آسکتی ہے۔

آج کا انشائیہ نگار موبائل فون کی مسلسل مصروفیت، سماجی رابطوں پر مصنوعی خوشیوں کی نمائش، معلومات کے ہجوم میں تنہائی، ہر لمحہ مصروف رہنے کے رجحان اور انسان کے بدلتے ہوئے تعلقات جیسے موضوعات کو اپنے مشاہدے کا حصہ بنا سکتا ہے۔ اِن موضوعات میں مزاح کے امکانات بھی ہیں اور سنجیدہ فکری مباحث کی گنجائش بھی۔

تاہم عصرِ حاضر کے انشائیہ نگار کے سامنے ایک بڑا چیلنج سطحیت اور فوری مقبولیت کا دباؤ بھی ہے۔ سوشل میڈیا پر مختصر جملے، فوری ردِ عمل اور عارضی دلچسپی اکثر تحریر کے معیار پر غالب آ جاتے ہیں۔ انشائیہ اُس وقت حقیقی ادبی قدر پیدا کرتا ہے جب اُس میں محض دل چسپ جملوں کی فراوانی کے بجائے فکر کی تازگی، مشاہدے کی صداقت اور اسلوب کی پختگی موجود ہو۔

انشائیے کی روایت پر جدید تنقیدی مباحث بھی اِس امر کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ اِس صنف کو کسی جامد تعریف میں محدود کرنے کے بجائے اِس کے تاریخی، تہذیبی اور اسلوبیاتی پہلوؤں کو ساتھ لے کر پڑھنا چاہیے۔ اُردو انشائیے کی روایت اور موجودہ صورتِ حال سے متعلق تحقیقی مطالعات اِس ضمن میں مفید رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔(٦)

ادبی رسائل اور جرائد اِس صنف کے فروغ میں آج بھی اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ انشائیے پر تنقیدی گفتگو، نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی، معیاری تحریروں کی اشاعت اور صنف کے فنی تقاضوں پر مکالمہ اُردو انشائیے کی روایت کو مزید مستحکم کر سکتا ہے۔

ایک کامیاب انشائیے کے تقاضے:

ایک کامیاب انشائیہ محض اچھے موضوع کے انتخاب سے وجود میں نہیں آتا۔ اِس کے لیے مصنف کو زبان و بیان پر قدرت، زندگی کے تجربات سے گہری واقفیت، مشاہدے کی قوت اور اپنے خیالات کو تخلیقی انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت درکار ہوتی ہے۔

موضوع کی انفرادیت اہم ضرور ہے، لیکن عام موضوع پر بھی غیر معمولی تحریر لکھی جا سکتی ہے۔ اصل سوال یہ نہیں کہ مصنف کس موضوع کا انتخاب کرتا ہے، بلکہ یہ ہے کہ وہ اِس موضوع کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے اور قاری کے سامنے کس انداز میں پیش کرتا ہے۔

اِسی طرح انشائیے میں اختصار اور جامعیت بھی اہم ہیں۔ غیر ضروری تفصیل، بار بار ایک ہی خیال کی تکرار، مصنوعی فلسفہ بگھارنے کی کوشش اور محض عبارت آرائی تحریر کی تاثیر کو کم کر سکتی ہے۔ اِس کے برعکس ایک مربوط تحریر، جس میں ہر جملہ کسی نہ کسی سطح پر مرکزی تاثر کو مضبوط کرتا ہو، قاری کے ذہن میں دیر پا نقش چھوڑ سکتی ہے۔

انشائیہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے موضوع کے ساتھ ایک زندہ تعلق قائم کرے۔ وہ جس چیز کے بارے میں لکھ رہا ہو، اُسے صرف معلومات کے ذریعے نہیں بلکہ اپنے مشاہدے اور احساس کے ذریعے بھی سمجھتا ہو۔ یہی داخلی وابستگی تحریر میں صداقت پیدا کرتی ہے، اور یہی صداقت انشائیے کو محض الفاظ کا مجموعہ بننے سے بچاتی ہے۔ اِس صنف کے فنی تقاضوں کو سمجھنے کے لیے محض منتخب انشائیوں کا مطالعہ کافی نہیں؛ انشائیے پر لکھی گئی تنقیدی کتابوں اور تحقیقی مقالات سے رجوع کرنا بھی ضروری ہے۔ اِس ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا کی انشائیہ کے خدوخال اور ڈاکٹر محمد اسداللہ کی مرتب کردہ یہ ہے انشائیہ خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔ پہلی کتاب صنف کے فنی مسائل کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے، جبکہ دوسری کتاب مختلف اہلِ قلم کی تنقیدی آرا اور انشائیوں کے مطالعے کا موقع فراہم کرتی ہے۔

اختتامیہ: زندگی کو دیکھنے کا ایک منفرد زاویہ:

اُردو انشائیہ ہماری نثری روایت کی ایک ایسی صنف ہے جو زندگی کی معمولی دکھائی دینے والی حقیقتوں میں غیر معمولی معنویت تلاش کرتی ہے۔ یہ ہمیں بتاتا ہے کہ ادب کے لیے ہمیشہ عظیم واقعات، غیر معمولی کرداروں یا پیچیدہ فلسفیانہ مباحث کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کبھی ایک معمولی سی عادت، ایک مانوس منظر، ایک بھولی بسری یاد یا ایک بے ضرر سی انسانی کمزوری بھی تخلیقی اظہار کا وسیلہ بن سکتی ہے۔ انشائیے کی اصل قوت اِس کی شخصی بصیرت، فکری آزادی، شگفتگی اور اسلوبی انفرادیت میں پوشیدہ ہے۔ یہ قاری کو زندگی کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ سنانے کے بجائے اُسے ایک نئے انداز سے دیکھنے کی دعوت دیتا ہے۔ اُس کی خوبی یہ ہے کہ وہ سنجیدگی کو بوجھل نہیں ہونے دیتا، مزاح کو سطحی نہیں بننے دیتا اور فکر کو خشک استدلال کی نذر نہیں ہونے دیتا۔ ایک کامیاب انشائیہ پڑھنے کے بعد قاری کے ذہن میں صرف چند خوب صورت جملے باقی نہیں رہتے، بلکہ اُس کی نگاہ میں بھی معمولی سی تبدیلی آتی ہے۔ وہ روزمرہ زندگی کے مانوس مناظر کو نئے احساس کے ساتھ دیکھنے لگتا ہے اور اُن چیزوں میں بھی معنویت تلاش کرتا ہے جنہیں وہ پہلے معمولی سمجھ کر نظرانداز کر دیتا تھا۔ یہی انشائیے کا حسن ہے اور یہی اِس کی ادبی اہمیت۔ یہ زندگی کی پیچیدگیوں کو ایک بے تکلف مسکراہٹ، ایک گہرے احساس اور ایک منفرد زاویۂ نظر کے ساتھ ہمارے سامنے رکھتا ہے۔ اُردو ادب میں انشائیے کی بقا اور ترقی اِسی تخلیقی قوت سے وابستہ ہے جو عام تجربے کو ادبی تجربہ، معمولی مشاہدے کو بامعنی فکر اور سادہ اظہار کو دل نشیں فن میں تبدیل کر دیتی ہے۔

بلاشبہ، انشائیہ محض لکھنے کا ایک طریقہ نہیں، بلکہ زندگی کو محسوس کرنے، سمجھنے اور اِس کے پوشیدہ حُسن کو دریافت کرنے کا ایک فن ہے اور جب تک انسان کے پاس حیرت، احساس، مشاہدے اور اظہار کی صلاحیت موجود ہے، اُردو انشائیے کے لیے نئے موضوعات، نئے اسالیب اور نئی معنویت کے دروازے کھلے رہیں گے۔

حوالہ جات و ماٰخذ:

١۔ آغا، وزیر۔ انشائیہ کے خدوخال۔ نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، ٢٠١٢ئ۔ ١١٨ صفحات۔

٢۔ ڈار، بلال احمد۔ "انشائیہ کی روایت مشرق و مغرب کے تناظر میں۔" قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی، ٢٠١٩ئ۔

٣۔ امجد، رشید، اور محمد افضل بٹ۔ "وزیر آغا کی انشائیہ نگاری۔" جرنل آف ریسرچ (اُردو)، جلد ١٩، شمارہ ١، صفحات ١٣–٢٤۔ تحقیقی مقالہ، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی سے متعلق جریدہ، ٢٠١١ء میں شائع شدہ آن لائن اندراج۔

٤۔ اسداللہ، محمد، مرتب۔ یہ ہے انشائیہ۔ ٢٠١٧ئ۔ ٢٢٢ صفحات۔ اس مجموعے میں انشائیے کے فن اور تنقید سے متعلق مختلف اہلِ قلم کی تحریریں شامل ہیں۔

٥۔ یوسفی، مشتاق احمد۔ چراغ تلے؛ خاکم بدہن؛ آبِ گم۔ اُردو طنز و مزاح اور نثر کے مطالعے کے لیے متعلقہ تصانیف۔

٦۔ "اُردو انشائیہ کی روایت اور موجودہ صورتِ حال۔" اُردو ریسرچ جرنل، آن لائن تنقیدی مطالعہ۔

بشکریہ پی ٹی بی سیالکوٹ

انشائیہ

کیا زمانہ تھا

تحریر: ڈاکٹر صلاح الدین حیدر

ایک زمانہ تھا جسے پنجابی میں "ویلہ" کہتے ہیں، زندگی بہت آہستہ خرام تھی 1968-69ء کے زمانے میں تانگے میں سوار ہو کر ادبی تقریبات میں شرکت کے لئے جاتے تھے تو گھوڑے کے نعلین کی ٹخ ٹخ سے رنگ تغزل میں سنگلاخ زمینوں کو سادگی سے برتنے کی تحریک ملتی تھی، ایک آنہ لائبریری سے اُردو نثر کے اسالیب تک رسائی ممکن تھی، لیکن زمانہ بدل رہا تھا، ہندوستان کی سماجی تباہی کے دور میں اُردو نثر کے کچھ جمال آفریں نثری نمونے کُتب خانوں میں دستیاب تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب علی گڑھ کے پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مضامین نے حیاتِ انسانی کے بڑے تاریخی تجربوں کے تناظر میں طنز و مزاح کی معنویت تک رسائی مہیا کی، تناظر کی معنویت اُردو تنقید میں کثرتِ استعمال سے رُوبہ زوال رہی، لیکن یہ ایک علیحدہ موضوع ہے۔ لوہاری گیٹ سے پیدل ہی یا تانگے کی اگلی نشست پر زمان و مکاں سے بے نیاز یہ ناچیز خوگرِ آزادی کسی نئی کتاب کی جستجو میں نیا مکتبہ حسین آگاہی پہنچ جاتا۔ اُس کے منتظم یا مدار لبہام سادہ لفظوں میں کرتا دھرتا جناب عطاء اللہ ملک بہت سادہ طبع لیکن غیر معمولی سیاسی کارکن تھے۔ زندگی کی کڑی آزمائشوں سے گزرنے کے عمل میں سر کے بال غائب ہو چکے تھے، کُتب کی ترتیب و تزئین سے فراغت کے بعد جب دوستوں کی بزم آباد ہوتی تو وہ کچھ زیادہ ہی فارغ البال نظر آتے۔ میں جس "ایک زمانہ تھا" کی بات کر رہا ہوں، تو ملک صاحب کے رُوبرو پہنچ کر سوال کیا کہ اُن کے پاس "پنج ہائے گرامایہ" کی کوئی کاپی موجود ہے۔ ملک صاحب میرے سوال پر ششدر رہ گئے اور اُردو گرد احباب اُن کے سر پر نظریں گاڑ کر تبسم زیرلب کی حد دسے آگے نکل گئے۔ یہ تو خیر ایک واقعہ ہے، کچھ عرصہ بعد ایک اور کُتب فروش سے دریافت کیا کہ کیا "ہم تصانیفِ رشحہ" کا کہیں سراغ مل سکتا ہے تو وہ "سب کو جوابِ رحمت میں جگہ ملے" کہہ کر دوسرے گاہک کی جانب متوجہ ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ پروفیسر نظیر صدیقی اور جناب لطیف عارف صاحب کی کاوشوں سے "نقشِ ہائے رنگ رنگ" "منظرِ عام پر نہیں آئی اِس کتاب کی اشاعت کے کچھ عرصہ بعد نظیر صدیقی بھی ہم نفسانِ رفتہ سے جا ملے۔ رشید احمد صدیقی صاحب کی تصنیف "طنزیات، مضحکات" نے علمی سطح پر اِس اسلوب نگارش کی جانب اہم اشارے مہیا کئے۔ اُن کی تحریروں اور بے مثل خاکوں کے پرستاروں نے اُن کی شخصیت کے گرد ادب و احترام کے ناطے ایک فضا قائم کی لیکن جو اصل روپ تھا وہ حوادثِ حیات کا ایک دلفریب اعشاریہ تھا جس میں شخصی زندگی کے ناموافق حالات اور عالمی تاریخ کے بحران یا اتار چڑھاؤ میں ایک خود شناسی آگہی یا دوسرے لفظوں میں بے بسی کی شناخت میں اُن کے اسلوب میں واقعات کی دلفریب تجسیم مہیا کر دی تھی۔ اُنہوں نے اوائل عمری میں معاشری مشکلات کے باعث جون پور میں کچہری، عدالت کے روزہ شب کو قریب سے دیکھا اور پھر جب ایم اے فارسی کرنے کے بعد علی گڑھ میں لیکچرار تعینات ہوئے تو تاریخ و سماجی زندگی کے مفتوح، گمنام گوشوں تک اپنے اسلوب کی حرکیت سے رسائی حاصل کی۔ اُن کے مضامین "کاروانِ طلواں تمام شوابد شد، دیہاتی ڈاکٹر، "نوآبادیاتی دور میں تدریسی، طب کے شعبے کی ایسے تصویریں ہیں جو بے ساختہ مزاح کے ساتھ اپنے حالات کی بے بسی پر غور و فکر کی تحریک بھی مہیا کرتی ہے۔ صدیقی صاحب کے مضامین میں فکر کی لہر درد مندی سے مربوط ہو کر خفیف کاروپ بھی دھار لیتی ہے اور بعض طنزیہ جملوں سے اُن کی قدامت پرست نقطۂ نظر کی ترجمانی ملتی تھی۔ لیکن درحقیقت وہ کسی انداز سے بھی سوچنے کی تحریک مہیا کرتے تھے کیونکہ وہ اپنی ذات پر ہنسنے کا ہنر بھی جانتے تھے۔

بات اُس زمانے کی تھی جو گزر گیا۔ کم و بیش اُسی دور میں یا کچھ پہلے مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط بعنوان "غبارِ خاطر" کے مطالعے کا موقع میسر ہوا۔ میں چونکہ چائے پیالے میں پیتا ہوں لہٰذا صبح چار بجے کے جانفزا وقت کے دوران فنجان کے سامنے دھرے ہونے اور طبع نالہ سنج کا مطلب سمجھ نہیں آیا۔ طبع نالہ سنج کا تو کچھ اعتبار نہیں ہوتا، کیا پتا کہاں سے کدھر نکل جائے لیکن قلعہ احمد نگر کی اسیری نے ناموافق حالات میں شاعرانہ، نثر کے ناطے مولانا کو ایک خوشگوار جہاں میں جینے کی تحریک مہیا کی، اُن کے اسلوب نے قارئین کو بھی مشکل، ناموافق حالات میں جینے کی راہ دکھائی۔ لیکن اِس دوران نثر میں جب اور جہاں کہیں کسی عربی شاعر کا کلام رُوبرو آیا تو کچھ ایسی کیفیت طاری ہوتی جیسے شدید موسم گرما کے دوران ٹرانسلامر کے جھلے سے اچانک بجلی چلی جائے۔ لیکن یہ زمانہ گزر چکا تھا۔ مولانا نے قلعہ احمد نگر کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے پوچھا تھا کہ جسے ہم حال کہتے ہیں۔ وہ فی الحقیقت ہے کہاں؟ لیکن پنجاب میں تو فی زمانہ گزرتے زمانے کو "بُرا حال تے بانکے دیہاڑے" عنوان سے شناخت کر لیا جاتا ہے۔ خیر حال کی خرابی کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ لیکن اُس زمانے میں اُردو نثر کے اسالیب میرے جیسی تانگے کی سواریوں کے تخیل کے لئے فراوانی اور اثر آفرینی کا باعث تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کئی محققین، شعراء دولت گیٹ سے پیدل چلتے ہوئے اندرون پاک گیٹ معروف شاعر، ادیب ارشد ملتانی صاحب کے مطب پہنچ جاتے تھے۔ مطب کیا تھا، یہ ایک چھوٹی سی دوکان تھی جس کے دروازے کے قریب لکڑی کے بنچ رکھے ہوتے تھے اور آخری کونے میں ایک بوسیدہ پردے کے عقب میں ایک ٹوٹے پھوٹے اسٹریچر کے ساتھ دیوار میں نصب دراز پر آلاتِ جراحی پڑے نظر آتے ہیں، ارشد صاحب جب جراحی کے کام میں منہمک ہوتے تو بڑے سے بڑا پھوڑا از قسم بھگندر بھی اُن کی جراحی کی تاب نہ لا سکتا تھا، کیا زمانہ تھا، گرمی کے موسم میں وہ غریب طبقے کے لوگوں کے لئے بہت بڑا سہارا تھے، کم و بیش ایک بجے کے قریب کام سے فراغت کے بعد ادبی مجلس کا آغاز ہو جاتا تھا، ہر آنے والے کو چائے پلائی جاتی تھی اگر کوئی ملنے نہ آئے تو فراغت کے لمحات میں علامہ نیاز فتح پوری کے نگاہ کے ملاحظات کا شوق سے مطالعہ کرتے تھے، یا فکر سخن میں مشغول ہو جاتے تھے، ایک بار کچھ محققین شعراء کی آمد کے بعد چائے کا دور شروع ہی ہوا تھا کہ یوسکی کی قمیض اور دھوتی زیب تن کئے ہوئے ایک مضطرب لیکن گبرو نوجوان، پہلوان کا ورود ہوا اور دھوتی کی جانب اشارہ کر کے فوری طور سے پر ملے (پھوڑے) کے ملاحظے، معائنے کی درخواست کی، جسے قبولیت کا شرف بخشا گیا اور فوری طور پر ٹوٹے ہوئے اسٹریچر پر احتیاط کی ہدایت کی گئی، پھر ارشد صاحب نے احباب سے پیشہ ورانہ مصروفیت کے باعث معذرت کی اور اوندھے پہلوان کی جراحت کے لئے پردے کے پیچھے چلے گئے، لیکن کچھ جھلکیاں پنچھیوں پر بیٹھے اہلِ قلم اور اکھاڑا مونا پہلوان کے کمزور جی دار تک بھی پہنچیں جو کہ اُس وقت اپنے پھوڑے کا معائنہ کرانے کی نیت سے آیا تھا۔

زمانہ یا وقت گزرنے سے واقعات کے بیان میں مبالغے یا افسانے کا رنگ نمایاں ہو جاتا ہے، مابعد کی شام کی محفلوں میں جب کبھی ارشد ملتانی صاحب کو ان کے کلینک کا یہ واقعہ سنایا تو حیران ہو کر ہنس پڑتے تھے۔ کم و بیش نصف صدی پر محیط اُن کی جراحی کی سرگرمیوں سے کسی کو کوئی شکایت نہ ہوئی۔ اتنے ہی عرصے پر محیط اُنہوں نے شاعری و تنقید کی مجالس میں بھی شرکت کی۔ ایک تنقیدی نشست کے دوران ایک نوجوان شاعر کی نظم پر رائے دی تو اگلے دن شاعر نے دولت گیٹ کے ریستوران میں تھمتھاتے ہوئے اِس رائے کا اظہار کیا کہ ظالم نے نظم کو ایسا ویسا جیسا کچھ کہا ویسا جیویں تلائی کینداہ (نظم کو ایسا زخم لگایا ہے جیسے پھوڑے کو کاٹا جاتا ہے) ریستوران کی ایک نشست میں ارشد صاحب نے یہ واقعہ سنتے ہوئے سگریٹ سلگایا اور ہنس کر باتوں میں محو ہو گئے۔ کیا زمانہ تھا، جو گزر گیا۔

بشکریہ پی ٹی بی سی ملتان

فکاہیہ کالم

نقل سے نقلِ مکانی تک

تحریر؛ پروفیسر ہمایوں

بیگم پر اپنی تعلیمی برتری اور رُعب جمانے کی خاطر حسبِ معمول کوئی خاص خبر نہ ہونے کے باوجود بھی صبح ناشتے کی میز پر اخبار پڑھنے میں مصروف تھا کہ ایک خبر نے دھیان کھینچ لیا "امتحانات میں نقل پر مکمل اور مستقل پابندی"۔۔۔۔۔

میرے ہونٹوں پر اک مبہم سی مسکراہٹ پھیل گئی کیونکہ اکثر لمبی لمبی چھوڑنے والے کبھی کبھار اتنی لمبی چھوڑ دیتے ہیں کہ بعد میں بات کو سنبھالنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جاتا ہے۔

اِسی اثناء میں بیگم صاحبہ نے بھی محسوس کیا تو پوچھ لیا "ارے میاں! ہمیں بھی تو پتہ چلے چپکے چپکے مسکرانے کی وجہ "۔۔؟ شاید وہ اپنے عورت ہونے کا ثبوت دے رہی تھی تبھی تو اخبار کے سامنے میرا مسکرانا برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔

میں نے ہڑبڑا کر جلدی سے کہا "بیگم! ہم سب اُمید سے ہیں"۔

بیگم نے دونوں اپنے سینے پر مارتے ہوئے بلند آواز میں کہا "ہائے میں مر گئی، اتنی بے تکی باتیں تو نہ کیجئے"۔

لیکن اگلے لمحے خود کو سنبھالتے ہوئے وضاحتی لہجے میں کہا "اِس بار امتحانات میں نقل بازی کی بجائے قلم بازی ہو گی"۔

بیگم صاحبہ نے منہ بسورتے ہوئے کہا "نقل اور پابندی۔۔؟؟ ارے یہ تو نہ ماننے والی بات ہوئی، اگر اِس ملک سے نقل کا رواج اُٹھ گیا تو یہ ملک ترقی کر نا ہی بند کر دے گا"۔

بیگمی باتیں سن کر میں بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ واقعی بھلا وہ کونسا امتحانی ہال ہو گا جہاں نقل نہ ہوتی ہو گی، طلباء وطالبات اور سہولت کار نقل سے یارانہ نہیں رکھتے ہوں گے۔ ہزر ہا اِس کی مخالفت کی جائے اور اِس کے تدارک میں تدابیر اختیار کی جائیں لیکن اِس کے عادی اور سہولت کار اپنا اُلو کسی نہ کسی طریقے سے سیدھا کر ہی لیتے ہیں۔ نقل کے مارے کو نقل کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ اِس کا نشہ بھنگ کی طرح ذہن اور عقل وشعور کو منجمد کر دیتا ہے۔ نقل کمبخت بذاتِ خود اتنی مست اور پُر خمار ہوتی ہے کہ اِس کو اگر خود سے ہم کلام ہونے کا موقع مل جائے تو اِس طرح سے گنگنائے گی کہ "میں چیز بڑی ہوں مست" البتہ نقل کو کبھی اپنے حق میں کچھ بولنا پڑے تو خود کو بے ضرر کہے گی اور ہمارے دماغی توازن کو غیر حاضر کہے گی۔ ہر سطح کے امتحان میں نقل کے سہولت کار اور متوالے اپنے ہتھکنڈوں میں مصروفِ عمل جبکہ پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں اس کاردِ عمل ہوتا ہے۔ لیکن طلباء کی مخفی رہنمائی اور اپنے لیے رسوائی کمارہے ہیں۔ موقع کی مناسبت سے طلباء کی آنکھیں چار اور ہم جیسے سفید پوشوں کی زبانیں لاچار ہو جاتی ہیں۔ نقل کا یہ میٹھا زہر طلباء کو گمراہی، معاشرے کو مفلسی رجحانات اور قوم کو تباہی کی طرف لے جا رہا ہے۔ طلباء لکیر کے فقیر رہتے ہوئے حسبِ ضرورت اور حسبِ خواہش لکیر پیٹتے رہتے ہیں۔ ایسے میں ہمارے دل دِل ناتواں اور دِل نداں نے اِس نقل پر پریشانی سے نقل مکانی کی سوچی ہے۔

آج کے طلباء گواہ چُست اور مدعی سُست کے سانچے میں پرورش پا رہے ہیں۔ کاہلی، سُستی اور کام چوری کی روش اپنا کر تن آسان بن چکے ہیں۔ وقت کے ضیاع کے بعد امتحانی ہال میں ناگہیں کا نپنا اور بغلوں میں جھانکنا اُن کا معمول بن چکا ہے۔ تعلیمی سطح پر محنت، مطالعے کی لگن اور تحقیق کے فن سے اُن کا سایہ بھی دُور بھاگتا ہے۔ کتاب سے دُوری اور موبائل کی مجبوری اُن کو اپنے مقاصد سے کہیں دور لے جا رہی ہے۔ ایسے موقع شناس اور آرام طلب طلباء کو جب نقل کی سہولت میسر آجائے تو اُن کے لئے سونے پہ سہاگہ اور نقل پر ڈاکہ آسان ہو جاتا ہے۔ دورانِ امتحان یہی طلباء اتنی تیزی سے نقل رسانی کا کام سرانجام دیتے ہیں کہ دُنیا کی تیز ترین ٹیکنالوجی بھی اِن کے سامنے ہاتھ جوڑنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ آج کے طلباء عموماً و معمولاً امتحانی ہال میں ہاتھوں کی صفائی اور اپنی ڈھٹائی پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ امتحانی ہال کی کھڑکیوں، روشن دانوں اور غیبی امداد کے ذریعے نقل کی نقل وحمل جاری وساری رہتی ہے۔

نقل کوئی اَنوکھی بات نہیں، اِس کا رواج ہمارے ہاں بہت پہلے پروان چڑھا ہے۔ ہمیں اپنا زمانہ امتحان اور بچپن سے جوانی تک کا تعلیمی سفر یاد ہے۔ امتحان کے آغاز سے پہلے ہم بڑی معصومیت اور بھولی بھالی شکل وصورت لیے کسی نہ کسی بیماری کا سہارا لے کر ایسی اداکاری کرتے کہ ابتدائی نقل کی پہلی سیڑھی ثابت ہو جاتی۔ سر درد کا بہانہ، پیٹ کا مروڑ، معدے کا درد اور بے ہوشی طاری ہونا ایسے دفاعی گر تھے جس سے ہم پورے گھر کو پریشان و حیران کرتے رہتے۔ ہماری ایسی حالت بیماری پر ابا جانی کو مہربانی آجاتی اور امتحانی عملے کو مع پورے اعزاز کے ساتھ گھر پر دعوتِ بہام دی جاتی۔ پورا عملہ امی جان کے بنائے کھانوں کا لُطف اُٹھاتے اور ہم خوشی خوشی اپنے ساتھ لگنکناتے۔ دورانِ بہام و مختصر قیام ابا جان بڑی خوش اخلاقی اور خوش مزاجی سے ہمارا تعارف کرواتے۔ ہم دنیا جہاں کی معصومیت چہرے پر سجائے اُن کے سامنے دوزانو ہو کر ایسے بیٹھ جاتے جیسے آج کل کی خواتین جعلی پیروں کے روبرو دو مجبور ولاچار بن کر بیٹھتی ہیں۔ اِس دعوتِ مہربانی سے ہمارا امتحانی سفر کافی آسان ہو جاتا اور امتحانی ہال میں ہماری معتبر حیثیت سب پر عیاں ہو جاتی۔ تب ہمیں دعوت کی اہمیت کا اندازا ہو جاتا اور اِس طرح ابا جانی کی دعوت کا اہتمام اور ہمارے نقل کا انتظام ہو جاتا اور صورتِ حال کچھ اِس طرح ہوتی۔

خوباں دعوت کی جب مجھ پر نمایاں ہو گئیں
میری ساری مشکلیں فی الفور آساں ہو گئیں
ممتحن سے جب کیا والد نے جا کر نک مُکا
امتحان کی مشکلیں سب میری آساں ہو گئیں

بشکریہ پی بی سی پشاور

نقل سے واسطہ رہا نقل مکانی تک
کبھی ہنستا کبھی روتا رہا جوانی تک
نئی نسل کس طرح محفوظ رہے اس لعنت سے
سوچ سوچ کے حیران ہوں حیرانی تک

میرا کتھارسس

عابد کاظمی



اُس سے میری دوستی اتنی گہری بھی نہیں تھی، بس ایک مشترکہ دوست کی شادی میں ملے، تو باتوں کا سلسلہ چل نکلا، گو کہ واقفیت تو پہلے سے تھی، لیکن اِس طرح مل بیٹھنے کا موقع اِس سے قبل نہیں ملا تھا، وہ بھی شاید خلوت پسند تھا، میں بھی شور سے گھبراتا ہوں، سو دونوں ایک دوسرے کے پیچھے، شادی ہال سے نکل کر قریبی پارک میں رکھی سنگی بینچ پر آکر بیٹھے، دُور اور دیر تک اپنے خیالوں میں کھوئے رہے۔

کتنی دلچسپ بات ہے نا۔۔۔۔ ہمارا دوست اپنی شادی خانہ بربادی کا جشن ہنسی خوشی منا رہا ہے، اور ہم دونوں سے اُس کا غم دیکھا نہیں جا رہا، اور اِدھر آ بیٹھے ہیں"

میں نے چونک کر اُسے دیکھا اور مسکرا دیا۔

"تو گویا آپ بھی "اہلِ برباد" میں شمار ہوتے ہیں؟

میں نے گردن موڑ کر پوچھا، اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا

"برباد تو نہیں کہہ سکتے، لیکن آباد بھی نہیں ہوں۔۔۔!

بینچ سے ٹیک لگا کر میں آسمان کو دیکھنے لگا، وہ مزید گویا ہوا۔

"حالانکہ میری بیوی بڑی ہی سلجھی ہوئی لڑکی ہے، ہر طرح سے میرا خیال رکھتی ہے، لیکن یہ جو پہلی محبت ہوتی ہے نا۔۔۔ آباد نہیں ہونے دیتی۔۔۔ برباد ہی رکھتی ہے۔۔۔"

وہ دُور کہیں کھو گیا۔

مجھے اُس کی سیاہ نصیب بیوی سے ہمدردی سی محسوس ہوئی۔

"آپ کو یاد نہیں آتی اپنی پہلی محبت؟"

میں کم گو ہر گز نہیں ہوں، لیکن جانے کیوں اُس رات میرا بات کرنے کو بالکل من نہیں تھا، آسمان پر چمکتا پورا چاند مسلسل مجھے آدھا ادھورا ہونے کا احساس دلا رہا تھا۔

"محبت، محبت ہی ہوتی ہے، پہلی، دوسری یا تیسری نہیں ہوتی، ویسے اگر اعداد میں جواب دوں تو مجھے صرف اپنی تیسری محبت ہی یاد آتی ہے ہر لمحہ ہر پل۔۔۔"

وہ بھی بینچ سے ٹیک لگا کر میری طرح چاند کو دیکھنے لگا، عجیب بات ہے کہ اُس کے یوں چاند کو دیکھنے پر مجھے رقابت محسوس ہوئی، جیسے وہ چاند صرف میرا ہو، میں نے چاند سے نظریں ہٹالیں۔

"کہاں ملے تھے آپ دونوں۔۔۔؟

اُس نے اِس طرح پوچھا جیسے میرا بچپن سے دوست رہا ہو؟

"ایک ہی جامعہ میں پڑھتے تھے"۔

کبھی کبھی دل کو کتھارسس چاہیئے ہوتا ہے، اور وہ راہ چلتے سے بھی اپنا بوجھ بانٹنے کو تیار ہو جاتا ہے، میں بھی اُس کے آگے دل کھول بیٹھا۔

"کیسی تھی وہ۔۔؟"

بینچ کے درمیان میں رکھے میرے ہاتھ کے اوپر اُس نے اپنا ہاتھ رکھ کر پوچھا۔۔۔ مجھے وہ لمس جانا پہچانا سا لگا۔۔۔ میرا دل ڈوبنے لگا، کئی لمحے میری آنکھوں میں تیرنے لگے

"بہت ذہین۔۔۔ بے حد خوبصورت۔۔۔ بے انتہا نازک، کانچ کی گڑیا

"وہ بھی آپ کو اتنا ہی چاہتی تھی؟"

اُس کے ہاتھ کے نیچے سے اپنا ہاتھ نکالتے ہوئے مجھے اپنی آواز سنائی دی۔

"اتنا ہی نہیں اِس سے بھی زیادہ۔۔۔ اُس محبت سے گندھی لڑکی کو محبت کے سوا کچھ آتا ہی نہیں تھا، آپ کو تو علم ہو گا، سماجی حوالے سے میں کتنا متحرک شخص ہوں، ہمہ وقت میرے آس پاس لوگوں کا جمِ غفیر رہتا، بتب بھی ایسا ہی سلسلہ رہتا تھا، میرا بہت کم وقت اُس کے حصے میں آتا تھا، بڑی صلح جو اور معاملہ فہم طبیعت تھی اُس کی، مجھے اپنی محبت میں قید کر کے جکڑا نہیں اُس نے، مجھے میری ذات کی قید سے رہائی دلا کر اپنی محبت کی فضا میں آزاد رہنے دیا۔۔۔"

بات کے اختتام پر اک گہری سانس لی میں نے۔

"پھر شادی کیوں نہیں کی اُس سے۔۔۔؟"

میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔۔۔ وہ خلاؤں میں کھویا ہوا تھا۔

"وہ ملی ہی بہت دیر سے، شادی تو کیا، میں اپنی تقریباً زندگی جی چکا تھا، اُن دنوں تو فقط گذارا ہو رہا تھا، وہ زندگی میں آئی تو پھر سے جینا آگیا۔۔۔"

"آپ بھی تو بتائیں کچھ اپنی زندگی کے بارے میں۔۔۔ آپ کی بیوی آپ کو کہاں تک سمجھتی ہے، کیسی ہے مزاجاً اور عادتاً، کتنی ذہنی ہم آہنگی ہے آپ دونوں کے درمیان۔۔؟"

میں نے اپنی یاسیت پر قابو پا کر اُس سے پوچھا، وہ چند لمحے میری آنکھوں میں دیکھنے لگا، اور پھر گویا ہوا۔

"پتا ہے دوست، ہم کبھی بھی بیوی کو محبوبہ کی مسند پر بٹھانا پسند نہیں کرتے، اور جانتے ہو کیوں نہیں کرتے؟ کیوں کہ اِترانا، شرمانا، لڑنا جھگڑنا، نخرے کرنا ہمیں محبوبہ پر ہی اچھا لگتا ہے، بیوی یہ سب کرے تو غصے کا موجب بنتی ہے، میں بھی بیوی اور محبوبہ میں تفریق رکھتا ہوں، لہذا میری بیوی اپنی حدود کو اچھے سے جانتی ہے، میری محبوبہ بننے کی کوشش نہیں کی اُس نے، جیسا میں کہتا ہوں وہی کرتی ہے، اور اِسی کو ہم میں سے اکثر لوگ ذہنی ہم آہنگی کہتے ہیں، خیر آپ یہ بتائیں اب "وہ" کہاں ہے؟ آپ اُنہیں بہت یاد کرتے ہوں گے نا۔۔۔؟"

اُس نے پھر سے میرے بائیں ہاتھ کی پشت پر اپنا ہاتھ رکھ کر یادوں کے زنگ آلود اور خراب مشینوں والے کھلونوں میں گویا چابیاں بھر دیں۔

"اُس کی شادی ہو گئی۔۔۔ بڑی حسرت سے معنی خیز باتیں کرتی تھی، اُسے میری ہمراہی کی خواہش تھی۔۔۔ پگلی۔۔۔ کانٹوں پر ننگے پاؤں چلنا چاہتی تھی! میرے خاندان میں عورت مٹی کے کھمبے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، میں اُس خوبصورت رنگین تتلی کو کانٹوں کی باڑھ میں قید نہیں کرنا چاہتا تھا، مجھے اُس کی آزادی عزیز تھی، سو میں نے اپنا نام نہ دے کر خاندان کی زنجیر نما روایتوں سے بچایا ہے، لیکن اُسے شاید یہ علم نہیں ہو گا، عین ممکن ہے اُس نے مجھے بزدل سمجھا ہو۔۔۔ میں جس عمر میں تھا وہ پختہ فیصلے کرنے والی عمر تھی، اے اپنا نا میرے لیے قطعی مشکل نہ تھا، البتہ رہنا مجھے اِسی خاندان میں تھا، نہ تو میں اپنی جڑیں کاٹ سکتا تھا، نہ ہی اُسے روایات کی پاسداری سے روک سکتا تھا، وہ بھی ہماری عورتوں کی طرح زندگی بسر کرتی تو میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا۔۔۔؟

میں نے ایک لمحے کو سانس لی، اور کچھ یاد آنے پر اُس کا ہاتھ پکڑ کر پُر جوش انداز میں اُس سے مخاطب ہوا۔

"پتا ہے میرے عام استعمال کی چیزیں وہ خریدتی رہتی تھی۔ مجھ پر کون سا رنگ اچھا لگے گا، یہ مجھ سے بہتر جانتی تھی، میرے کپڑے لیتی، چائے کے کئی مگ، پانی پینے کی بوتل حتیٰ کہ سونے کے لیے تکیہ

بھی اُسی کا دیا ہوا ہے میرے پاس، بالوں کا برش، چابیوں کے کی چینز، ڈائری، قلم، ہڈی اسپریا یسے گھر میں اُس سے ملتے رہتے تھے، اُسے بڑی فکر رہتی تھی کہ میں عید پر نیا جوڑا سلواؤں کے پہنوں، جب تک ساتھ تھی، وہ خود لیتی تھی میرے عید کے کپڑے۔۔۔ جب سے وہ گئی ہے میں نے عیدیں منانا چھوڑ دی ہیں، اُس کی دی ہوئی چیزوں کو اب تک میں نے پرانا ہونے نہیں دیا، تم یہ جان کر حیران ہو گے کہ میں اب تک اُس کی سالگرہ کے دن کیک لاتا ہوں، اور اکیلا بیٹھ کر کاٹتا ہوں، بہت یاد آتی ہے مجھے، اپنی سالگرہ کے دن شاید اُسے میرا خیال بھی نہ آتا ہو کہ یہیں کہیں کوئی اپنے آفس میں تنہا بیٹھا اُس کی سالگرہ کے کیک پر اُس کی عمر کے ہندسوں کو شمع کی صورت کیک پر جلاتے ہوئے آبدیدہ ہوتا ہو گا۔۔۔ اب تو وہ اپنے بچوں اور ہم سفر کے ہمراہ سالگرہ میں مناتی ہو گی، کتنی مکمل زندگی ہو گی اُس کی۔۔۔ اور میں جانتا ہوں، ایسی زندگی اُس کی میری دعاؤں کی بدولت ہو گی۔۔۔

چشمہ اُتار کے میں نے اپنی بھیگی آنکھوں کے گوشے پونچھ لیے، اُس نے میرا شانہ تھپتھپایا تو میں نے اُس سے پوچھا:

"کتنے پھول ہیں آپ کے گلشن میں؟"

"دو۔۔۔"

بس دو۔۔۔؟ آپ کی شریکِ حیات کو یہ نمبر پسند ہے یا آپ خود چھوٹی فیملی کو پسند کرتے ہیں؟"

مجھے یاد آنے لگا۔۔۔ وہ بھی دو سے زائد بچوں کو "سزا" سے تعبیر کرتی تھی، میں اسے بارہ بچے تجویز کرتا تھا اور وہ بچوں کی طرح ہنس پڑتی تھی، مخاطب کی آواز مجھے دُور سے سنائی دی۔

"میں دو بچے ہی افورڈ کر سکتا ہوں اِس لیے۔۔۔"

مجھے اُس مشینی آدمی پر حیرت سی ہونے لگی، بچے نہ ہوئے کوئی بھاری بل ہوئے۔

"اچھا شادی کے بعد کوئی خیر خبر اُس کی، کیسی بسر ہو رہی ہے اُس کی زندگی"

اُس نے موضوع بدل دیا۔

"شادی سے پہلے ہی اندازہ تھا کہ کیسی گذرے گی اُس کی۔۔۔"

"اچھا کیا اندازہ تھا۔۔۔؟"

یہی کہ شادی کے بعد وہ خود میں کہیں نہیں رہے گی، کھو جائے گی"

ابھی میں اور بھی بہت سی باتیں شیئر کرنا چاہتا تھا، عرصہ بعد تو کوئی کتھارسس ملا تھا، اتنے میں وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور شادی ہال میں چلنے کو کہنے لگا، ہم۔۔، ہم قدم ہو کے اُس طرف جانے لگے جہاں شور و غل اور رنگوں کی بارش ہو رہی تھی۔

اگلے دن آفس میں بیٹھا ڈاک دیکھ رہا تھا، ایک لفافے میں سے ایک رقعہ برآمد ہوا۔۔۔

"کل رات مسلسل میں آپ سے آپ کی محبوبہ کی باتیں پوچھتا رہا اور آپ مجھ سے میری بیوی کی۔۔۔ حالانکہ میں بھی چاہتا تھا کہ آپ بھی میری طرح میری محبت کی روداد پوچھتے رہیں، خیر مزے کی بات یہ کہ آپ کی محبوبہ اور میری بیوی میں جو لنک ہے اِسی کی بنا پر ہی میں آج اُسے "چھوڑ" رہا ہوں، آپ "اپنا" لینا۔۔۔"

میرے ذہن میں یک لخت محبوبہ کا تصور ایک "ماں" میں ڈھل گیا جس کے دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، جن کی جدائی میں وہ بلک رہی ہے۔ مجھے اُس شخص پر شدید غصہ آنے لگا، اور آہستہ آہستہ ذہن سُن ہونے لگا، محبوبہ کے بعد پھر اُس "ماں" کا تصور بھی ذہن کی اسکرین سے جھماکے سے غائب ہوا اور میں اندھیرے میں ڈوب گیا۔



بشکریہ پی بی سی اردو کانہ

ایشیا پیسیفک میڈیا فورم ریڈیو پاکستان کے لیے ایک نیا باب

تحریر: ذیشان حیدر

دنیا تیزی سے بدل رہی ہے۔ ٹیکنالوجی نے انسانی زندگی کے تقریباً ہر شعبے کو متاثر کیا ہے اور ابلاغ کا میدان بھی اِس تبدیلی سے مستثنیٰ نہیں۔ آج سے چند برس بعد میڈیا کی دنیا کس شکل میں ہو گی، اِس بارے میں حتمی پیش گوئی شاید ممکن نہ ہو، لیکن یہ حقیقت واضح ہے کہ اطلاعات، صحافت اور نشریات کے شعبے میں تبدیلی کی رفتار پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ تیز ہو چکی ہے۔

سوشل میڈیا، ڈیجیٹل پلیٹ فارمز، مصنوعی ذہانت اور جدید مواصلاتی ٹیکنالوجی نے خبر کی تیاری، ترسیل اور وصولی کے روایتی طریقوں کو بدل دیا ہے۔ آج ایک خبر صرف ریڈیو، ٹیلی وژن یا اخبار کے ذریعے نہیں پہنچتی بلکہ چند لمحوں میں موبائل فون، ویب سائٹس، پوڈکاسٹس اور سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کے ذریعے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ جاتی ہے۔ ایسے ماحول میں میڈیا اداروں کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ بدلتی ہوئی ٹیکنالوجی کو سمجھیں، نئے تجربات سے سیکھیں اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کے امکانات پیدا کریں۔

اِسی تناظر میں ایشیا پیسیفک خطے کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ دنیا کی ایک بڑی آبادی اِس خطے میں آباد ہے، کئی بڑی اور تیزی سے ترقی کرتی ہوئی معیشتیں یہاں موجود ہیں اور ٹیکنالوجی کے میدان میں بھی ایشیا پیسیفک دنیا کے اہم مراکز میں شمار ہوتا ہے۔ اِس لیے اِس خطے کے میڈیا اداروں کے درمیان رابطہ اور تعاون صرف صحافتی ضرورت نہیں بلکہ وسیع تر علاقائی روابط کا ایک اہم ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔

اِنہی تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے ایشیا پیسیفک میڈیا فورم ایک ایسے پلیٹ فارم کے طور پر سامنے آیا ہے جہاں مختلف ممالک کے میڈیا ادارے اپنے تجربات شیئر کر سکیں، جدید ٹیکنالوجی اور مصنوعی ذہانت کے استعمال پر تبادلۂ خیال کر سکیں، مشترکہ منصوبوں کے امکانات تلاش کر سکیں اور ثقافتی وابلاغی روابط کو فروغ دے سکیں۔

حالیہ دنوں میں ایشیا پیسیفک میڈیا فورم کے رُکن ممالک کا اہم اجلاس چین کے شہر شینزن میں منعقد ہوا۔ اجلاس کا مرکزی موضوع تھا: ایشیا پیسیفک کمیونٹی کی مشترکہ خوشحالی کی راہ ہموار کرنا، میڈیا کا اتفاقِ رائے اور عملی اقدام۔ اجلاس میں تقریباً 400 مندوبین نے شرکت کی جبکہ 42 ممالک اور خطوں سے تعلق رکھنے والے 200 سے زائد میڈیا اداروں، بین الاقوامی تنظیموں، تحقیقی اداروں اور سفارتی اداروں کے نمائندے بھی شریک ہوئے۔ پاکستان کے لیے اِس اجلاس کی خاص اہمیت اِس پیش رفت کی وجہ سے ہے کہ پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن، یعنی ریڈیو پاکستان، ایشیا پیسیفک میڈیا فورم کے 16 بانی ممالک کے میڈیا اداروں میں شامل ہے۔ حالیہ اجلاس میں پاکستان کی نمائندگی پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن کے ڈائریکٹر جنرل سعید احمد شیخ نے کی۔

یہ پیش رفت ریڈیو پاکستان کے لیے اہم ہے کیونکہ پاکستان کا قومی نشریاتی ادارہ کئی دہائیوں پر محیط ایک مضبوط پیشہ ورانہ روایت کا حامل ہے۔ ریڈیو پاکستان نے ملک میں نشریاتی صحافت کے فروغ، خبروں اور معلومات کی فراہمی، تعلیم، ادب، ثقافت اور تفریح کے شعبوں میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اِس ادارے سے وابستہ کئی نسلوں کے صحافی، براڈکاسٹر، فنکار، صداکار، ادیب اور پروگرام پروڈیوسرز نے پاکستان کی ابلاغی تاریخ میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔

اِسی لیے ریڈیو پاکستان کو محض ایک نشریاتی ادارہ سمجھنا اِس کے تاریخی کردار کو محدود کرنا ہو گا۔ یہ ادارہ پاکستان کے ثقافتی اور ابلاغی ورثے کا بھی ایک اہم حصہ ہے۔ اِس کے آرکائیوز میں پاکستان کی سیاسی، سماجی، ادبی اور ثقافتی تاریخ کے کئی اہم ادوار کی آوازیں محفوظ ہیں۔

ایشیا پیسیفک میڈیا فورم کی بانی رکنیت ریڈیو پاکستان کو خطے کے دیگر میڈیا اداروں کے ساتھ اپنے تجربات شیئر کرنے اور اُن سے سیکھنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ اِس پلیٹ فارم کے ذریعے پاکستان کی ثقافت، تاریخ، زبانوں اور معاشرتی تنوع کو وسیع تر علاقائی سامعین تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ اِسی طرح مشترکہ پروگراموں، تربیتی منصوبوں، تکنیکی تعاون، مواد کے تبادلے اور جدید نشریاتی طریقوں کے حوالے سے بھی نئے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔

موجودہ دور میں اِس تعاون کی اہمیت اِس لیے بھی بڑھ گئی ہے کہ مصنوعی ذہانت میڈیا کے شعبے کو تیزی سے تبدیل کر رہی ہے۔ نیوز رومز، آڈیو پروڈکشن، ترجمے، تحقیق، مواد کی تیاری اور ڈیجیٹل تقسیم سمیت متعدد شعبوں میں مصنوعی ذہانت کے استعمال کے امکانات سامنے آ رہے ہیں۔ اِسی طرح پوڈکاسٹنگ، آن لائن آڈیو اور ڈیجیٹل پلیٹ فارمز نے ریڈیو کے روایتی تصور کو بھی وسعت دے دی ہے۔

اب ریڈیو کی آواز صرف ریڈیو سیٹ تک محدود نہیں۔ ایک پروگرام پوڈکاسٹ کی شکل میں دنیا کے کسی بھی حصے تک پہنچ سکتا ہے، ایک تاریخی ریکارڈنگ ڈیجیٹل آرکائیو کا حصہ بن سکتی ہے اور ایک مقامی زبان میں تیار کیا گیا پروگرام عالمی سامعین تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔

یہی وہ میدان ہے جہاں ریڈیو پاکستان کے لیے علاقائی تعاون نئے امکانات پیدا کر سکتا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی سے متعلق تجربات کا تبادلہ، پیشہ ورانہ تربیت، ڈیجیٹل میڈیا کی مہارت اور مشترکہ پروڈکشنز پاکستان کے قومی نشریاتی ادارے کو نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے میں معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔

پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن پہلے ہی متعدد بین الاقوامی نشریاتی تنظیموں کے ساتھ روابط رکھتا ہے، جن میں Asia-Pacific Broadcasting Union (ABU) اور Asia-Pacific Institute for Broadcasting Development (AIBD) شامل ہیں۔ ایشیا پیسیفک میڈیا فورم کی بانی رکنیت ان روابط کو مزید وسعت دینے اور علاقائی سطح پر نئے تعاون کی راہیں تلاش کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔

تاہم اصل اہمیت رکنیت حاصل کرنے سے زیادہ اِس بات کی ہے کہ اِس موقع کو کس طرح عملی نتائج میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ مشترکہ پروگرام، تربیتی منصوبے، ثقافتی مواد کا تبادلہ، جدید ٹیکنالوجی سے استفادہ اور نوجوان میڈیا پروفیشنلز کے لیے علاقائی مواقع اِس تعاون کو بامعنی بنا سکتے ہیں۔

اِس کے لیے حکومتی سطح پر بھی ریڈیو پاکستان کی بدلتی ہوئی ضروریات کو سمجھنا ہو گا۔ جدید دور کا قومی نشریاتی ادارہ صرف روایتی ریڈیو اسٹیشن نہیں ہوتا۔ اِسے جدید اسٹوڈیوز، ڈیجیٹل انفراسٹرکچر، تحقیق، تربیت، آرکائیونگ اور نئی میڈیا ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ کرنے کے لیے مناسب وسائل اور سہولیات درکار ہوتی ہیں۔

دنیا میں میڈیا اب صرف خبر پہنچانے کا ذریعہ نہیں رہا۔ یہ قومی تشخص، ثقافتی سفارت کاری، عوامی رابطے اور عالمی سطح پر ملک کا تعارف پیش کرنے کا بھی ایک مؤثر وسیلہ ہے۔ پاکستان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے قومی نشریاتی ادارے کے وسیع تجربے اور موجودہ صلاحیتوں کو جدید ٹیکنالوجی کے ساتھ جوڑتے ہوئے علاقائی تعاون کے نئے مواقع سے فائدہ اُٹھائے۔

ایشیا پیسیفک میڈیا فورم میں ریڈیو پاکستان کی بانی رُکن کی حیثیت سے شمولیت اِسی سمت میں ایک اہم موقع ہے۔ یہ موقع پاکستان کو اپنی آواز خطے تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ خطے کی آواز سننے، تجربات سے سیکھنے اور نئے ابلاغی رشتے قائم کرنے کا راستہ بھی فراہم کرتا ہے۔

آخر کار آنے والے دور میں کامیاب وہی میڈیا ادارے ہوں گے جو روایت اور جدت کے درمیان توازن قائم کر سکیں گے۔ ریڈیو پاکستان کے پاس تاریخ، تجربہ، انسانی وسائل اور وسیع قومی رسائی کی مضبوط بنیاد موجود ہے۔ اب اِس بنیاد کو جدید ٹیکنالوجی، تحقیق، تربیت اور علاقائی تعاون کے ساتھ جوڑنے کی ضرورت ہے۔

ایشیا پیسیفک میڈیا فورم میں ریڈیو پاکستان کی شمولیت محض ایک ادارہ جاتی اعزاز نہیں؛ یہ پاکستان کے قومی میڈیا کے لیے ایک نئے علاقائی سفر کا دروازہ ہے۔ اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ اِس دروازے سے گزر کر ہم اِسے کس قدر بامعنی، مؤثر اور دیرپا شراکت داری میں تبدیل کرتے ہیں۔



ایک یادگار ملاقات، ایک علمی نشست اور ایک روشن تاثر

ڈائریکٹر جنرل جناب سعید احمد شیخ کا دورۂ آزاد کشمیر ریڈیو میرپور

علی اختر سلیم

دفتر میں بیٹھا کسی کام میں مصروف تھا کہ اچانک کانوں میں اسٹیشن ڈائریکٹر کے دفتر میں نصب گھنٹی کی مدھم سی آواز سنائی دی۔ آواز تو دھیمی تھی، مگر اس میں ایک ایسی کشش تھی کہ ذہن بے اختیار اُس جانب متوجہ ہو گیا۔ ابھی اِس آواز کے مفہوم پر غور ہی کر رہا تھا کہ ارشد صاحب پیغام لے کر آ پہنچے کہ میم نے یاد فرمایا ہے۔ چند ہی لمحوں بعد ہم جناب اسٹیشن ڈائریکٹر کے دفتر میں موجود تھے۔ میڈم خوش بخت شیریں صاحبہ نے حسبِ معمول خوش گوار انداز میں گفتگو کا آغاز کیا اور پھر گویا خبر دی کہ علی! ڈائریکٹر جنرل صاحب کل میرپور تشریف لا رہے ہیں۔ ہم نے مدبرانہ انداز میں دریافت کرنے کی جسارت کی کہ حضور کی آمد کا سبب کیا ہے؟ معلوم ہوا کہ میرپور میں کشمیر پریمیئر لیگ فٹ بال ٹورنامنٹ کا فائنل منعقد ہونے جا رہا ہے اور جناب سعید احمد شیخ صاحب اِس تقریب میں بطور خاص مہمان شرکت فرمائیں گے۔ یہ خبر سنتے ہی دل میں ایک خوش گوار احساس نے جنم لیا۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ ہمارے ادارے کے سربراہ آزاد کشمیر کے ایک اہم کھیلوں کے ایونٹ میں شرکت کے لیے تشریف لا رہے تھے۔ اِس سے بڑھ کر مسرت اِس خیال میں تھی کہ اُنہیں ہمارے خطے کی ثقافت، روایات، مہمان نوازی اور لوگوں کے رہن سہن کو قریب سے دیکھنے اور محسوس کرنے کا موقع ملے گا۔ تاہم خوشی کے اِن احساسات کے ساتھ ذہن کے کسی گوشے میں ایک فطری سی تشویش نے بھی جگہ بنائی۔ ڈائریکٹر جنرل صاحب تشریف لا رہے ہیں، ملاقات میں کیا گفتگو ہو گی؟ وہ ادارے کے بارے میں کیا پوچھیں گے؟ ہماری کارکردگی اور شعبہ جاتی امور پر کیا سوالات ہوں گے؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُن کے سامنے اپنے خیالات کس انداز میں پیش کیے جائیں گے؟ یہ وہ سوالات تھے جو ذہن میں گردش کرنے لگے۔ بہر حال، آنے والے وقت نے اِن تمام خدشات کو ایک خوش گوار تجربے میں بدل دینا تھا۔ بالآخر جناب سعید احمد شیخ صاحب تشریف لے آئے۔ پہلی ہی نشست میں اُن کی گفتگو نے یہ احساس دلایا کہ بعض شخصیات کا علم محض کتابوں تک محدود نہیں ہوتا، بلکہ اُن کی گفتگو میں مطالعے کی وسعت، مشاہدے کی گہرائی اور تجربے کی پختگی یکجا ہو جاتی ہے۔ ابتدائی ملاقات ہی میں اُنہوں نے علم و آگہی کے ایسے موتی بکھیرے کہ محفل کا ہر لمحہ کسی نئی دریافت سے کم محسوس نہ ہوا۔ تاریخ سے حالاتِ حاضرہ تک، ادب سے سائنس تک اور سماجی معاملات سے قومی امور تک، ہر موضوع پر سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ اُن کی گفتگو کا ایک نمایاں پہلو یہ تھا کہ وہ کسی موضوع کو محض معلومات کی سطح پر بیان نہیں کرتے تھے، بلکہ اُس کے پسِ منظر، اسباب اور نتائج کو بھی سامنے لاتے تھے۔ اُن کے اندازِ بیان میں دلیل کی مضبوطی بھی تھی اور الفاظ میں سادگی و روانی بھی۔ یہی امتزاج سامع کو نہ صرف متوجہ رکھتا ہے بلکہ اُسے سوچنے اور اپنے فہم کو وسعت دینے پر بھی آمادہ کرتا ہے۔ تاریخ کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اُنہوں نے تاریخی واقعات کے مطالعے میں پائی جانے والی غلطیوں، روایات کی جانچ اور تاریخ نویسی کے اصولوں پر روشنی ڈالی۔ اُن کی گفتگو سے یہ نکتہ نمایاں ہوا کہ تاریخ محض گزرے ہوئے زمانوں کے واقعات کا مجموعہ نہیں، بلکہ ایک سنجیدہ علمی شعبہ ہے جس میں تحقیق، شواہد اور غیر جانب دارانہ تجزیے کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اُنہوں نے اِس امر کی طرف بھی توجہ دلائی کہ کسی تاریخی واقعے کو سمجھنے کے لیے صرف اُس کے بیان پر اکتفا کرنا کافی نہیں، بلکہ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اُسے کس نے، کن حالات میں اور کن شواہد کی بنیاد پر قلم بند کیا۔ اِس طرح کی گفتگو نے تاریخ کے مطالعے کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کا موقع فراہم کیا۔ اِس علمی نشست میں ہمارے خطے کے موجودہ حالات بھی زیرِ بحث آئے۔ آزاد کشمیر کی جغرافیائی، تاریخی اور سیاسی اہمیت کے تناظر میں گفتگو آگے بڑھی تو قومی سلامتی اور پاکستان کے استحکام کی اہمیت پر بھی مدلل اظہارِ خیال ہوا۔ اُنہوں نے قومی معاملات کو وسیع تر تناظر میں دیکھنے کی ضرورت اُجاگر کی۔ اُن کی گفتگو سے یہ تاثر اُبھرا کہ کسی بھی ملک کی مضبوطی صرف اُس کے جغرافیائی وجود سے عبارت نہیں ہوتی، بلکہ قومی یکجہتی، اداروں کی مضبوطی، اجتماعی شعور اور ذمہ دارانہ طرزِ عمل بھی اُس کے استحکام میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ وقت گزرنے کا احساس اُس وقت ہوا جب رات کافی ڈھل چکی تھی۔

گفتگو کا سلسلہ اگرچہ دل چسپ تھا، مگر اگلے روز کی مصروفیات بھی ہماری منتظر تھیں۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ صبح آزاد کشمیر ریڈیو میرپور کی عمارت میں ایک نشست ہو گی، جس میں ادارے کے تمام ملازمین کو ڈائریکٹر جنرل صاحب کے ساتھ تبادلۂ خیال کا موقع ملے گا۔ یوں پہلی ملاقات کی یادیں اور نئی گفتگو کی اُمیدیں لیے ہم اپنے اپنے ٹھکانوں کی جانب روانہ ہو گئے۔ اگلی صبح براڈکاسٹنگ ہاؤس میں معمول سے بڑھ کر چہل پہل تھی۔ سبھی اپنے اپنے کاموں کے ساتھ ساتھ مہمانِ گرامی کی آمد کے منتظر تھے۔ کچھ ہی دیر بعد جناب سعید احمد شیخ آزاد کشمیر ریڈیو میرپور تشریف لے آئے اور اسٹیشن ڈائریکٹر محترمہ خوش بخت شیریں کے دفتر میں تمام ملازمین کے ساتھ نشست کا آغاز ہوا۔ یہ محض ایک رسمی ملاقات نہیں تھی، بلکہ ادارے کے مختلف شعبوں سے وابستہ افراد کو اپنی بات کہنے، اپنے تجربات بیان کرنے اور ادارے کی بہتری کے لیے تجاویز پیش کرنے کا موقع بھی تھا۔ ریڈیو پاکستان کی اہمیت، بدلتے ہوئے ابلاغی منظرنامے اور موجودہ دور میں نشریاتی اداروں کو درپیش چیلنجز پر گفتگو ہوئی۔ اِس موقع پر ملازمین کو اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی تاکہ وہ اپنے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں ادارے کی بہتری کے لیے تجاویز پیش کر سکیں۔ جناب سعید احمد شیخ نے ہر ایک کی بات توجہ سے سنی۔ اُن کا انداز ایسا تھا کہ گفتگو میں شریک افراد کو یہ احساس ہوا کہ اُن کی رائے محض رسمی کارروائی کا حصہ نہیں، بلکہ اُسے اہمیت دی جا رہی ہے۔ کسی ادارے کے سربراہ کی جانب سے اپنے ملازمین کو سننا اور اُن کے خیالات کو سمجھنے کی کوشش کرنا بلاشبہ ایک مثبت انتظامی رویے کی علامت ہے۔ بعد ازاں اُنہوں نے ریڈیو پاکستان کی بہتری، ادارے کو درپیش مسائل اور ملازمین کی فلاح و بہبود کے لیے کیے جانے والے اقدامات پر تفصیلی گفتگو کی۔ اُن کی باتوں سے ادارے کے انتظامی معاملات اور مستقبل کی سمت کے بارے میں آگاہی حاصل ہوئی۔ اُنہوں نے واضح کیا کہ کسی بھی ادارے کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ اِس کے وسائل کو بہتر انداز میں بروئے کار لایا جائے، ملازمین کی صلاحیتوں کو نکھارنے کے مواقع فراہم کیے جائیں اور بدلتے ہوئے حالات کے مطابق کام کرنے کے طریقوں میں بہتری لائی جائے۔ ریڈیو پاکستان ایک ایسا ادارہ ہے جس نے کئی دہائیوں تک قوم کی آواز بن کر خدمات انجام دی ہیں۔ یہ محض خبریں نشر کرنے یا تفریح فراہم کرنے کا ذریعہ نہیں، بلکہ زبان و ادب کے فروغ، ثقافتی ورثے کے تحفظ، قومی شعور کی بیداری اور دور دراز علاقوں تک معلومات پہنچانے میں بھی اہم کردار ادا کرتا رہا ہے۔ موجودہ ڈیجیٹل دور میں جب ابلاغ کے ذرائع تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں، ریڈیو کی ذمہ داریاں بھی پہلے سے زیادہ اہم ہو گئی ہیں۔ ایسے میں روایتی نشریاتی تجربے کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا وقت کی ضرورت ہے۔ اِس حوالے سے ہونے والی گفتگو نے ہمیں اپنے کام کی اہمیت اور مستقبل کے امکانات پر غور کرنے کا موقع دیا۔ نشست کے بعد دورے کا اگلا مرحلہ شروع ہوا، مختلف شعبوں کا معائنہ اور اُن کی کارکردگی کا جائزہ۔ جناب سعید احمد شیخ نے آزاد کشمیر ریڈیو میرپور کے مختلف شعبوں کا دورہ کیا۔ ہر شعبے میں ہونے والے کام، دستیاب سہولیات اور روزمرہ امور کا جائزہ لیا گیا۔ اِس دوران متعلقہ عملے سے گفتگو بھی ہوئی اور جہاں ضرورت محسوس ہوئی، وہاں بہتری کے لیے ہدایات جاری کی گئیں۔ ایک سرکاری ادارے میں معائنہ محض عمارت، کمروں اور آلات کو دیکھنے کا نام نہیں ہوتا، بلکہ اِس کا اصل مقصد یہ جاننا ہوتا ہے کہ دستیاب وسائل کس حد تک مؤثر انداز میں استعمال ہو رہے ہیں اور کارکردگی کو مزید بہتر بنانے کے لیے کن اقدامات کی ضرورت ہے۔ اِس اعتبار سے یہ دورہ ہمارے لیے اہمیت کا حامل تھا۔ اِس سے نہ صرف مختلف شعبوں کے کام کو اُجاگر کرنے کا موقع ملا، بلکہ اُن امور کی نشاندہی بھی ممکن ہوئی جن پر مزید توجہ دے کر ادارے کی کارکردگی میں بہتری لائی جا سکتی ہے۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ڈائریکٹر جنرل نے مختلف شعبوں کی کارکردگی کو سراہا۔



یعنی اُن کی جانب سے حوصلہ افزائی کے یہ کلمات ہم سب کے لیے باعثِ مسرت تھے۔ اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف عملے کے لیے اِس سے بڑھ کر اطمینان کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ اُس کی محنت کو دیکھا جائے، اُس کے کام کو تسلیم کیا جائے اور اُسے مزید بہتر کارکردگی کے لیے حوصلہ دیا جائے۔ یہ تعریف محض چند اچھے الفاظ نہیں تھی، بلکہ ہمارے لیے ایک اعزاز اور اپنی ذمہ داریوں کو پہلے سے زیادہ لگن کے ساتھ نبھانے کی تحریک بھی تھی۔ اِس موقع پر اسٹیشن ڈائریکٹر خوش بخت شیریں نے ڈائریکٹر جنرل کا خصوصی شکریہ ادا کیا۔ اُنہوں نے اِس بات کا ذکر کیا کہ زلزلے میں تباہ ہونے والی آزاد کشمیر ریڈیو میرپور کی عمارت کی بحالی اور ادارے کو دوبارہ اپنے گھر منتقل کرانے کے لیے کیے گئے اقدامات ریڈیو میرپور کے ملازمین کے لیے نہایت اہمیت رکھتے ہیں۔ کسی ادارے کی عمارت محض اینٹوں، سیمنٹ اور چھت کا مجموعہ نہیں ہوتی۔ اِس کے ساتھ وہاں کام کرنے والوں کی یادیں، محنت، وابستگی اور پیشہ ورانہ شناخت بھی جڑی ہوتی ہے۔ آزاد کشمیر ریڈیو میرپور کی عمارت بھی ہمارے لیے اِسی نوعیت کی اہمیت رکھتی ہے۔ زلزلے کے باعث پیدا ہونے والی مشکلات کے بعد اپنی عمارت میں واپسی ہمارے لیے ایک جذباتی اور پیشہ ورانہ اعتبار سے خوش گوار تجربہ تھا۔ اِس لیے اِس حوالے سے انتظامی سطح پر کیے گئے اقدامات کا اعتراف اور اُن پر اظہارِ تشکر بجا طور پر ضروری تھا۔ دورے کے دوران ایک اور پہلو ایسا سامنے آیا جس نے رسمی دفتری ماحول کو اپنائیت میں بدل دیا۔ کھانے کا وقت ہوا تو توقع تھی کہ معمول کے مطابق مہمانِ گرامی کے لیے علیحدہ انتظام ہو گا، مگر جناب سعید احمد شیخ صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنے محکمے کے ملازمین کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائیں گے۔ یہ سادہ سا فیصلہ اپنے اندر ایک خوب صورت پیغام رکھتا تھا۔ ادارے کے سربراہ کا اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک ہی دسترخوان پر بیٹھنا اِس بات کا اظہار تھا کہ دفتری عہدوں اور انتظامی

ذمہ داریوں کے باوجود باہمی احترام اور انسانی تعلقات اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ تمام ملازمین کو مدعو کیا گیا اور سب نے اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اِس دوران گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہا اور کھانے کے ساتھ شعر و سخن کی محفل بھی سج گئی۔ یوں ماحول میں ایک ایسی بے تکلفی پیدا ہوئی جس میں علم و ادب، مزاح اور روزمرہ تجربات ایک دوسرے سے گھل مل گئے۔ کبھی کسی شعر کا ذکر ہوتا، کبھی کسی ادبی شخصیت کا حوالہ آتا اور کبھی گفتگو کسی نئے موضوع کی طرف مڑ جاتی۔ اِس محفل نے یہ احساس مزید گہرا کیا کہ علم رکھنے والا شخص اگر اپنی گفتگو میں سادگی اور اپنے رویے میں انکسار بھی رکھتا ہو تو اُس کی شخصیت دوسروں کے دلوں پر دیرپا اثر چھوڑتی ہے۔ اِس مصروف دن کا ایک اہم اور یادگار مرحلہ ابھی باقی تھا۔ ہمیں جناب سعید احمد شیخ کے ساتھ ایک پوڈکاسٹ ریکارڈ کرنے کا موقع ملا۔ ایک نشریاتی ادارے سے وابستہ فرد کے لیے یہ موقع خصوصی اہمیت رکھتا ہے کہ وہ اپنے سربراہ سے براہِ راست گفتگو کرے اور اُن کے خیالات کو سامعین تک پہنچانے کا ذریعہ بنے۔ چنانچہ پوڈکاسٹ کے لیے نشست کا اہتمام کیا گیا اور گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔ تقریباً ایک گھنٹے پر محیط اِس پوڈکاسٹ میں علم، تاریخ، ادب، تحقیق، قومی امور اور ابلاغی ذمہ داریوں سمیت مختلف موضوعات زیرِ بحث آئے۔ گفتگو کا انداز ایسا تھا کہ ہر سوال کے جواب میں محض ایک مختصر رائے سامنے نہیں آتی تھی، بلکہ اُس کے ساتھ متعلقہ پس منظر اور دلیل بھی بیان ہوتی تھی۔ یہ نشست ہمارے لیے پیشہ ورانہ اعتبار سے بھی مفید تھی اور علمی اعتبار سے بھی۔ ایک طرف ہمیں اپنے کام کے حوالے سے سوالات کرنے اور موضوعات کو مزید سمجھنے کا موقع ملا، تو دوسری طرف اُن کے تجربات اور مطالعے سے استفادہ کرنے کا بھی موقع نصیب ہوا۔ پوڈکاسٹ کی تکمیل کے بعد جناب سعید احمد شیخ کشمیر پریمیئر لیگ ہال ٹورنامنٹ کے فائنل کی جانب روانہ ہوئے۔ کچھ دیر میچ دیکھا اور ہم بھی اُن کے ہمراہ موجود رہے۔ میرپور کی سرزمین پر منعقد ہونے والے اِس کھیلوں کے ایونٹ میں اُن کی شرکت دورے کا ایک اہم حصہ تھی۔ کھیلوں کی سرگرمیاں معاشرے میں مثبت رجحانات کو فروغ دینے، نوجوانوں کو صحت مند مصروفیات فراہم کرنے اور مختلف طبقات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے میں اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ فائنل کے موقع پر موجود لوگوں کا جوش و خروش اور کھیل کے لیے اُن کی دلچسپی اِس بات کی عکاسی کر رہی تھی کہ کھیل محض مقابلے کا نام نہیں، بلکہ اجتماعی خوشی اور باہمی رابطے کا ذریعہ بھی ہیں۔ یوں دورے کے تمام مراحل بتدریج اپنے اختتام کو پہنچے۔ واپسی کا وقت آیا تو ہم نے جناب سعید احمد شیخ کو رخصت کیا۔ دونوں جانب سے شکریے کے کلمات ادا ہوئے اور پھر ہر شخص اپنے اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ بظاہر یہ ایک سرکاری دورہ تھا، جس میں ملاقاتیں ہوئیں، مختلف شعبوں کا معائنہ کیا گیا اور ایک اہم کھیلوں کے ایونٹ میں شرکت کی گئی۔ لیکن ہمارے لیے اِس دورے کی اہمیت اِن رسمی سرگرمیوں سے کہیں بڑھ کر تھی۔ اِس دوران ہمیں ریڈیو پاکستان کی بہتری کے لیے کیے جانے والے اقدامات کے بارے میں جاننے کا موقع ملا۔ ادارے کے مختلف شعبوں کی کارکردگی کا جائزہ لینے، ملازمین کی تجاویز سننے اور اُن کی حوصلہ افزائی کے عمل نے بھی ایک مثبت تاثر چھوڑا۔ تاہم اِس پورے دورے کا سب سے نمایاں پہلو وہ شخصیت تھی جسے قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ ہم نے جناب سعید احمد شیخ کو محض ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز افسر کی حیثیت سے نہیں دیکھا، بلکہ ایک ایسے صاحبِ علم انسان کے طور پر پایا جن کے مطالعے کی وسعت، گفتگو کی گہرائی اور مختلف موضوعات پر گرفت متاثر کن تھی۔ اُن کی شخصیت میں علمی وقار کے ساتھ ملنساری، انتظامی ذمہ داری کے ساتھ سادگی اور منصبی مقام کے ساتھ انسانی اپنائیت بھی نمایاں محسوس ہوئی۔ اُن کا اپنے ملازمین کی بات سُننا، اُن کے ساتھ وقت گزارنا، مشترکہ دسترخوان پر بیٹھنا اور مختلف شعبوں کی کارکردگی کو سراہنا ایسے پہلو تھے جنہوں نے اِس تاثر کو مزید مضبوط کیا۔ اُن کی گفتگو سے یہ احساس بھی ہوا کہ تحقیق محض کتابوں میں معلومات جمع کرنے کا نام نہیں، بلکہ سوال اُٹھانے، شواہد کو پرکھنے، مختلف زاویوں سے سوچنے اور کسی نتیجے تک پہنچنے کے لیے مسلسل جستجو کا نام ہے۔ ایسی شخصیات کی صحبت میں گزرنے والا وقت انسان کو یہ احساس دلاتا ہے کہ علم کی کوئی آخری منزل نہیں۔ ہر ملاقات میں کچھ نیا سیکھنے ہر گفتگو میں کسی نئے پہلو کو سمجھنے اور ہر تجربے میں اپنے فہم کو بہتر بنانے کی گنجائش موجود رہتی ہے۔ آزاد کشمیر ریڈیو میرپور کا یہ دورہ ہمارے لیے اِسی نوعیت کا تجربہ ثابت ہوا۔ اِس نے ایک طرف ادارے کے انتظامی اور پیشہ ورانہ معاملات کو سمجھنے میں مدد دی، تو دوسری طرف ایک ایسی شخصیت کے علمی اور انسانی پہلوؤں کو قریب سے دیکھنے کا موقع بھی فراہم کیا جن کے بارے میں پہلے ہمارا تصور زیادہ تر اُن کے منصب تک محدود تھا۔ اب اِس ملاقات کی یاد ذہن میں تازہ ہوتی ہے تو وہ ابتدائی گھنٹی بھی یاد آتی ہے جس کی مدھم آواز نے ہمیں اسٹیشن ڈائریکٹر کے دفتر تک پہنچایا تھا۔ اُس وقت ہمیں اندازہ نہ تھا کہ چند لمحوں بعد ملنے والی اطلاع ایک ایسے تجربے کا آغاز بنے گی جو علم، مشاہدے، ادارہ جاتی وابستگی اور انسانی تعلقات کی کئی خوب صورت پرتیں اپنے اندر سمو لے گا۔ بعض ملاقاتیں محض ملاقاتیں نہیں ہوتیں، بلکہ سوچ کے دریچے کھول دیتی ہیں۔ بعض شخصیات اپنے الفاظ سے زیادہ اپنے رویے کے ذریعے متاثر کرتی ہیں، اور بعض دورے اپنے اختتام کے بعد بھی ذہن و دل میں جاری رہتے ہیں۔ جناب سعید احمد شیخ کا دورہ آزاد کشمیر ریڈیو میرپور ہمارے لیے ایک ایسا ہی تجربہ تھا: ایک ایسا موقع جس نے ہمیں ادارے کے مستقبل کے بارے میں سوچنے، اپنی ذمہ داریوں کو نئے جذبے سے دیکھنے اور علم و تحقیق کی اہمیت کو مزید گہرائی سے محسوس کرنے کا موقع فراہم کیا۔ اور شاید کسی بھی ملاقات کی اصل کامیابی یہی ہوتی ہے کہ جب مہمان رخصت ہو جائے تو اُس کی موجودگی صرف یادوں میں باقی نہ رہے، بلکہ اُس کے خیالات، رویے اور گفتگو سے حاصل ہونے والی روشنی بھی ہمارے ساتھ چلتی رہے۔

بشکریہ آزاد کشمیر ریڈیو میرپور

ریڈیو پاکستان بہاول پور میں طلباء کے درمیان نغماتِ قائد کا مقابلہ

رپورٹ: فیض رسول ہاشمی

بانی پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح کے 150ویں جشنِ ولادت کے سلسلے میں ریڈیو پاکستان بہاول پور کے سٹوڈیوز میں اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کی پرفارمنگ آرٹس سوسائٹی کے اشتراک سے طلباء و طالبات کے درمیان "ہم تجھ سے وعدہ کرتے ہیں" کے عنوان سے نغماتِ قائد کا مقابلہ منعقد کیا گیا جس میں طلباء و طالبات نے نغماتِ قائد پیش کیے اور اپنی خوب صورت آواز اور فنِ موسیقی کا مظاہرہ کیا۔ مقابلے میں محمد اویس رحمان نے پہلی، اویس رضا نے دوسری جبکہ ابراہیم حسن نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔ مقابلے کے ججز میں شعبہ خصوصی تعلیم اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے سربراہ اور پرفارمنگ آرٹس سوسائٹی کے ایڈوائزر پروفیسر ڈاکٹر آصف ندیم اور ریڈیو پاکستان بہاول پور کی سینئر پروڈیوسر عاصمہ ظہور شامل تھیں۔ اِس موقع پر اسٹیشن ڈائریکٹر سجاد احمد بری نے کہا کہ قائدِ اعظم محمد علی جناح کی خدمات اور اُن کے افکار و نظریات کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے ریڈیو پاکستان بہاول پور مختلف پروگراموں کا انعقاد کر رہا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ قائدِ اعظمؒ کے 150ویں جشنِ ولادت کی مناسبت سے ریڈیو پاکستان بہاول پور کے لائیو اسٹوڈیو کو "جناح سٹوڈیو" کا نام بھی دیا گیا ہے۔ اُنہوں نے طلبہ و طالبات کی جانب سے نغماتِ قائد کے مقابلے میں بھرپور شرکت کو سراہتے ہوئے کہا کہ نئی نسل کو قائدِ اعظمؒ کے افکار، قومی یکجہتی اور پاکستان سے محبت کے پیغام سے روشناس کرانا ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر آصف ندیم نے کہا کہ ریڈیو پاکستان نے قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک قومی، ادبی اور ثقافتی اقدار کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ ریڈیو پاکستان بہاول پور اور پرفارمنگ آرٹس سوسائٹی کے اشتراک سے ایسے مقابلوں کا انعقاد نوجوانوں کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ اِس موقع پر پروگرام مینیجر ریڈیو پاکستان بہاول پور محمد عاشق عباسی نے کہا کہ قائدِ اعظم محمد علی جناح کی شخصیت اور افکار ہماری قومی شناخت کا اہم حصہ ہیں۔ نوجوان نسل کو قائدِ اعظمؒ کے پیغام سے روشناس کرانے کے لیے ایسے پروگرام اور مقابلے نہایت اہم ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ ریڈیو پاکستان بہاول پور آئندہ بھی نوجوانوں کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے مواقع فراہم کرتا رہے گا۔

مقابلے کے پروڈیوسر فیض رسول ہاشمی تھے جبکہ ریکارڈنگ کی ذمہ داریاں انجینئر محمد کامران اور محمد ذیشان نے انجام دیں۔ تقریب کے اختتام پر مقابلے میں نمایاں پوزیشن حاصل کرنے والے طلباء و طالبات میں اسناد بھی تقسیم کی گئیں۔



میں کشمیر کی ہوں آواز
ریڈیو آزاد کشمیر مظفر آباد کی سالگرہ

تحریر: خالد محمود

کھیتوں میں کھلیانوں میں
ہرے بھرے میدانوں میں
میرے یار، میرے دم ساز
میں کشمیر کی ہوں آواز
میری بات کے سو انداز
نام خدا سے کرتا ہوں
اپنی بات کا میں آغاز
میں کشمیر کی ہوں آواز

یہ آواز 15 اکتوبر 1960ء میں حُریت و آزادی کی صدائے عام بن کر آزادی و حُریت کے متوالوں کے پردۂ سماعت پر وجد آفرین پیغام اور استبداد کے لیے پیامِ مرگ ثابت ہوئی۔ یہ آواز تھی آزاد کشمیر ریڈیو مظفر آباد کی۔ 10 کلو واٹ شارٹ ویو اور پھر 100 کلو واٹ میڈیم ویو ٹرانسمیٹر سے دارالحکومت مظفر آباد میں اِس نشرگاہ نے نظریاتی محاذ پر "کشمیر بنے گا پاکستان" اور نظریۂ پاکستان کی بھرپور ترجمانی کی۔

مسعود قریشی بانی اسٹیشن ڈائریکٹر تھے بعد ازاں علمی و ادبی شخصیت عزیز حامد مدنی اور یوسف ظفر نے اِس محاذ پر بطور اسٹیشن ڈائریکٹر خدمات سرانجام دیں۔ 08 اکتوبر 2005ء کے زلزلے میں ہائی پاور ٹرانسمیٹر اور براڈ کاسٹنگ ہاؤس ملبے کا ڈھیر بن گیا۔ 30 سے زیادہ لاشیں اُٹھانے کے بعد ملبے کے ڈھیر سے ایک مرتبہ پھر آواز گونجی "زندگی پھر مسکرائے گی" اور

اگر ہے جذبۂ تعمیر زندہ
تو پھر کس چیز کی ہم میں کمی ہے

یہی جذبہ تھا جس کی بدولت ایف ایم 93 میگا ہرٹز پر نشریات کے ذریعے تعمیر و بحالی اور تحریکِ آزادی کے محاذ پر دوبارہ کام کا آغاز ہوا۔ آج ایف ایم 93 میگا ہرٹز کے علاوہ تقریباً 70 ہزار Followers فیس بک پر پوری دنیا میں اِس آواز کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ صبحِ کشمیر (اردو) سوہنی دھرتی (پہاڑی) پیارا وطن (گوجری) نوبہار (کشمیری) اور محفلِ شب (اردو) کے عنوان







سے پروگراموں کے ذریعے تحریکِ آزادیٔ کشمیر، نظریۂ پاکستان، پاکستانیت اور امن و محبت اور خیر کا پیام اب پوری دنیا میں پھیل رہا ہے۔ آزاد کشمیر ریڈیو مظفر آباد جدید تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال رہا ہے اور جلد ہی عالمی نشریاتی اداروں کی صف میں منفرد مقام حاصل کرے گا۔ کیونکہ ہم مکمل ڈیجیٹلائزیشن کی طرف رواں دواں ہیں۔ ترقی و انفرادیت اور معیار و سچائی ہماری پہچان ہے۔ کیونکہ یہ آزاد کشمیر ریڈیو مظفر آباد ہے جس کا نعرہ ہے کہ:

"میں کشمیر کی ہوں آواز"

بشکریہ پی پی سی مظفر آباد

زلزلہ آٹھ اکتوبر
اگر ہے جذبۂ تعمیر زندہ

تحریر: خالد محمود

جذبۂ تعمیر ہی زندگی کی روانی کا باعث ہے۔ انسان جذبوں سے عبارت ہے۔ جذبات قانون و آئین اور فطرت سے ہم آہنگ نہ ہوں تو نظامِ حیات بگڑ جائے۔ بقول احمد ندیم قاسمی

جہاں سے پھول ٹوٹا تھا وہیں سے
کلی سی اِک نمایاں ہو رہی ہے

تخریب و تعمیر متوازی سفر اختیار کیے ہوئے ہیں۔ بقول اقبالؒ

گرچہ بر ہم ہے قیامت سے نظامِ ہست و بود
ہیں اِسی آشوب سے بے پردہ اسرارِ وجود
زلزلے سے کوہ و در اُڑے ہیں مانندِ سحاب
زلزلے سے وادیوں میں تازہ چشموں کی نمود
ہر نئی تعمیر کو لازم ہے تخریبِ تمام
ہے اِسی میں مشکلاتِ زندگانی کی کشود

08 اکتوبر 2005ء میں آزاد کشمیر کے ضلع مظفر آباد، نیلم، جہلم ویلی، باغ، اور خیر پختون خواہ کے علاقے بالا کوٹ، مانسہرہ اور وفاقی دار الحکومت کے بعض علاقوں میں 7.6 شدت کے زلزلے نے کہرام برپا کر دیا۔ آزاد کشمیر کے متاثرہ علاقوں میں 73 ہزار سے زیادہ لوگ لقمۂ اجل بن گئے۔ ہزاروں مضروب ہوئے اور بعض تو اب تک مستقل معذوری کا شکار ہیں۔

18 اکتوبر 2005ء کے قیامت خیز زلزلے کے بعد تعمیر و بحالی کے لیے اُس وقت کی حکومت نے عالمی اداروں اور دوست ممالک کی مدد سے intrrnational donner conference کا انعقاد کیا اور سات ارب روپے سے زیادہ رقم جمع کی۔ تقریباً سو سے زائد ممالک کے رضاکاروں نے تعمیر و بحالی کے کام میں مدد کی۔

وطنِ عزیز کے ہر پیر و جوان نے دامے، درمے، اہلِ کشمیر کی بے پناہ مدد کی۔ پاک فوج نے تعمیر و بحالی و ریسکیو کے لئے کلیدی اور اہم کردار ادا کیا۔

مظفر آباد کے دارالحکومت میں ضلعی دفاتر پرانے سیکرٹریٹ کی سرکاری عمارتیں، جامعۂ کشمیر سٹی کیمپس سی ایم ایچ راولا کوٹ، مظفر آباد شہر، باغ، جامعہ کشمیر کا چھتر کلاس کیمپس، ہائر سیکنڈری پرائمری و ثانوی درجے کے تعلیمی ادارے، شاہراہیں اور ریل عالمی اداروں کے تعاون سے تعمیر کیے گئے اور زراعت و لائیو سٹاک کی بحالی کے لیے سماجی ترقی کے منصوبے تیار کیے گئے کیونکہ جذبۂ تعمیر زندہ تھا اور پاکستان کا بچہ بچہ کشمیر کے ساتھ کھڑا تھا۔ 2005ء میں ہی تعمیر و بحالی کے ERRA ادارے کو وفاقی سطح پر قائم کرنے کے بعد ریاست آزاد جموں و کشمیر میں SERRA کی بنیاد رکھی گئی تاکہ آئندہ کسی بھی قدرتی آفت سے بچا جا سکے اور ریسک یو و بحالی میں آسانی ہو۔ آزاد ریاست جموں و کشمیر میں SDMA کی بنیاد بھی رکھی گئی تاکہ آئندہ کسی بھی قدرتی آفت کے اثرات کو کم کیا جا سکے اور ریسک یو و بحالی میں آسانی ہو۔

بقول احمد ندیم قاسمی

اگر ہے جذبۂ تعمیر زندہ
تو پھر کس چیز کی ہم میں کمی ہے
جہاں بجلی گری تھی اب وہی شاخ
نئے پتے پہن کر تن گئی ہے
جہاں کل زندگی مبہوت سی تھی
وہیں پر آج ننھے گونجتے ہیں
اگر ہے جذبۂ تعمیر زندہ



آزاد ریاست جموں و کشمیر میں قائم ہونے والی نئی حکومت کے بلڈنگ کوڈ کے نفاذ اور بڑے منصوبوں کو مکمل کرنے کے ساتھ ساتھ لاری اڈوں کو شہر سے باہر منتقل کرنے کا اعلان کیا ہے جس سے نو تعمیر شدہ شہر میں خوبصورتی آئے گی۔ زلزلے کو 21 سال گزر چکے ہیں مگر اہلِ مظفر آباد کے زخم ابھی مندمل نہیں ہوئے کہ اُن کے پیارے اُن سے بچھڑ گئے تھے۔ زلزلے کے فوراً بعد ملبے کے ڈھیر سے اِک آواز گونجی:

"یہ آزاد کشمیر ریڈیو مظفر آباد ہے"

آزاد ریاست جموں و کشمیر کے قلب میں واقع ریاست کے واحد ریڈیو اسٹیشن کے اکلوتے سینئر پروڈیوسر طاہر چغتائی نے ایف ایم 101MHZ کی فریکوئنسی سے ایک آواز دی:

"زندگی پھر مسکرائے گی"

اِسی سلوگن کو بعد ازاں تمام اداروں نے ریسکیو اور بحالی کا نعرہ بنا لیا۔ ریڈیو نے اپنا جاندار کردار ادا کیا اور اُمید سے زندگی کی رونقیں پھر بحال ہوئیں۔ ایف ایم 101-2005ء سے 2009ء تک تعمیر و بحالی میں عوام کے ہمراہ رہا۔ اِس دوران بے شمار سربراہانِ مملکت، عالمی اداروں کے سربراہان اور امدادی اداروں کے کارکن اپنی آواز سے ایف ایم 101 مظفر آباد کے ذریعے عوامی جذبوں کو پروان چڑھاتے رہے اور آزاد کشمیر ریڈیو کی ٹیم اور سینئر پروڈیوسر طاہر چغتائی اپنی ٹیم کے ہمراہ کام میں مصروف رہے۔ عوامی خدمت اور ریاستی آئین و قانون کے علمبرداری اور نظریۂ پاکستان کی ترویج کا یہ سفر ابھی رُکا نہیں۔ اسٹیشن ڈائریکٹر طاہر چغتائی اور اُن کی ٹیم اب بھی عوامی طاقتوں اور پردۂ بصارت پر عوام کے ساتھ ساتھ ہیں۔

آج زلزلے کو 21 سال ہو گئے ہیں۔ اب بھی آزاد کشمیر ریڈیو مظفر آباد ناگہانی آفات اور اُن سے نمٹنے کی تیاری کے حوالے سے عوام میں شعور پھیلا رہا ہے۔ اِس ضمن میں محفوظ تعمیرات اور محفوظ مستقبل کے حوالے سے دستاویزی پروگرام اور انٹرویوز نشر کیے جاتے ہیں کیونکہ جذبۂ تعمیر زندہ ہے اور محفوظ تعمیرات ہی محفوظ مستقبل کی ضمانت ہیں۔

آزاد کشمیر ریڈیو میرپور کی 24ویں اور ایف ایم 101 میرپور کی 17ویں سالگرہ کی پُروقار تقریب

علی اختر سلیم



آزاد کشمیر ریڈیو میرپور نے اپنی نشریاتی خدمات کے 24 سال مکمل کر لیے، جبکہ ایف ایم 101 میرپور بھی اپنے قیام کے 17 سال پورے ہونے پر ایک اہم سنگِ میل عبور کر گیا۔ اِس موقع پر ایک پُروقار سالگرہ کی تقریب کا انعقاد کیا گیا، جس میں شہر کی معزز شخصیات، ریڈیو سے وابستہ ملازمین، فنکاروں اور مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ تقریب کے مہمانانِ خصوصی ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر ڈاکٹر فدا حسین اور چوہدری محمود احمد تھے، جبکہ تقریب کی صدارت ڈاکٹر ریاض احمد نے کی۔ تقریب کا باقاعدہ آغاز تلاوتِ کلامِ پاک سے ہوا، جس کی سعادت آزاد کشمیر ریڈیو میرپور کے مالی سید عباس شاہ کو حاصل ہوئی۔

بعدازاں معروف نعت خواں زبیر الحسن جرال نے بارگاہِ رسالت مآبؐ میں نعتِ رسولِ مقبولؐ پیش کر کے محفل کو روحانی کیفیت سے آراستہ کیا۔ تقریب میں ریڈیو کے ملازمین اور آر ٹسٹس کے علاوہ میرپور شہر کے مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے افراد کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ شرکاء کی بھرپور موجودگی اِس امر کی عکاس تھی کہ آزاد کشمیر ریڈیو میرپور آج بھی عوام کے دلوں میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ تقریب کے صدر ڈاکٹر ریاض احمد نے اپنے خطاب میں کہا کہ آزاد کشمیر ریڈیو میرپور نے مقامی آبادی کی آواز کو ملک کے ہر کونے تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اِس ادارے نے نہ صرف مقامی لوگوں کے مسائل، جذبات اور احساسات کی ترجمانی کی بلکہ اپنی نشریات کے ذریعے کشمیری عوام کے ساتھ یکجہتی کا پیغام بھی عام کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ آزاد کشمیر ریڈیو میرپور نے مقبوضہ کشمیر کے اپنے بہن بھائیوں کی آواز بن کر انہیں یہ احساس دلایا ہے کہ وہ تنہا نہیں، بلکہ آزاد کشمیر کے عوام اُن کے ساتھ کھڑے ہیں۔ اُن کے مطابق ذرائع ابلاغ کا بنیادی مقصد صرف معلومات اور تفریح فراہم کرنا نہیں، بلکہ عوامی مسائل کو اُجاگر کرنا، مظلوموں کی آواز بننا اور معاشرے میں شعور و آگہی پیدا کرنا بھی ہے۔ ڈاکٹر ریاض احمد نے ریڈیو سے وابستہ ملازمین اور فنکاروں کی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ کسی بھی ادارے کی کامیابی میں اِس کے کارکنوں کی محنت، لگن اور خلوص بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ اُنہوں نے اُمید ظاہر کی کہ آزاد کشمیر ریڈیو میرپور مستقبل میں بھی اپنی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے عوامی خدمت کا سلسلہ جاری رکھے گا۔ مہمانِ خصوصی ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر ڈاکٹر فدا حسین نے اپنے خطاب میں کہا کہ آزاد کشمیر ریڈیو میرپور نے تفریح کے ساتھ ساتھ صحتِ عامہ کے حوالے سے عوامی آگہی پیدا کرنے میں بھی مؤثر کردار ادا کیا ہے۔ صحت سے متعلق معلومات، بیماریوں سے بچاؤ کی تدابیر اور صحت مند طرزِ زندگی کے فروغ کے لیے ریڈیو ایک اہم ذریعہ ہے، جس کے ذریعے عام لوگوں تک مفید پیغامات آسانی سے پہنچائے جا سکتے ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ صحت مند معاشرے کی تشکیل کے لیے عوام کو بروقت اور مستند معلومات فراہم کرنا ضروری ہے۔ اِس مقصد کے حصول میں ذرائع ابلاغ کا کردار نہایت اہم ہے۔ ڈاکٹر فدا حسین نے اِس اُمید کا اظہار کیا کہ آزاد کشمیر ریڈیو میرپور آئندہ بھی صحتِ عامہ سے متعلق پروگراموں کے ذریعے عوام کی رہنمائی کرتا رہے گا۔ تقریب کے دوسرے مہمانِ خصوصی چوہدری محمود احمد نے اپنے خطاب میں مقامی زبانوں اور ثقافتی ورثے کے تحفظ کے حوالے سے ریڈیو کی اہمیت کو اُجاگر کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ آزاد کشمیر ریڈیو میرپور ہماری مقامی زبانوں کا محافظ ہے اور اِس ادارے کی بدولت نئی نسل کو اپنے آباؤ اجداد کی زبانوں، روایات اور تہذیبی اقدار سے روشناس کرانے میں مدد مل رہی ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ زبان کسی بھی قوم کی شناخت اور اِس کے ثقافتی ورثے کا بنیادی حصہ ہوتی ہے۔ مقامی زبانوں میں پروگرام نشر کرنے سے نہ صرف اِن زبانوں کو فروغ ملتا ہے بلکہ نئی نسل کا اپنی تہذیب اور تاریخ سے تعلق بھی مضبوط ہوتا ہے۔ اُنہوں نے ریڈیو انتظامیہ کی کوششوں کو سراہتے ہوئے اِس اُمید کا اظہار کیا کہ ادارہ علاقائی زبانوں اور ثقافت کے تحفظ کے لیے اپنا کردار مزید مؤثر انداز میں ادا کرتا رہے گا۔ بلاشبہ ریڈیو محض تفریح کا ذریعہ نہیں، بلکہ تعلیم، معلومات، ثقافت اور سماجی شعور کے فروغ کا ایک مؤثر وسیلہ بھی ہے۔ یہ عوام کو باخبر رکھنے کے ساتھ ساتھ مختلف طبقات کے درمیان رابطے اور ہم آہنگی پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ آزاد کشمیر ریڈیو میرپور نے اپنے 24 سالہ سفر میں مقامی آبادی کو اظہار کا پلیٹ فارم فراہم کرنے، علاقائی ثقافت کو اُجاگر کرنے اور عوامی مسائل کو منظرِ عام پر لانے کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ اِسی طرح ایف ایم 101 میرپور نے بھی اپنے 17 سالہ سفر میں سامعین کے ساتھ تعلق مضبوط بنانے اور معلومات و تفریح کو عام کرنے میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔ اِن دونوں نشریاتی اداروں کی سالگرہ اِس امر کی یاد دہانی ہے کہ عوامی خدمت کے لیے قائم اداروں کی اصل کامیابی عوام کے اعتماد اور اُن سے مضبوط وابستگی میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ تقریب کے اختتام پر اسٹیشن ڈائریکٹر آزاد کشمیر ریڈیو میرپور خوش بخت شریں نے تمام مہمانوں، شرکاء اور تقریب میں معاونت کرنے والے افراد کا شکریہ ادا کیا۔ اُنہوں نے معزز شخصیات کی شرکت کو ادارے کے لیے باعثِ اعزاز قرار دیتے ہوئے ریڈیو کے ملازمین اور آر ٹسٹس کی خدمات کو بھی سراہا۔ اُنہوں نے اِس عزم کا اظہار کیا کہ آزاد کشمیر ریڈیو میرپور عوامی خدمت، معیاری نشریات، علاقائی زبانوں کے فروغ اور ثقافتی ورثے کے تحفظ کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھے گا۔ آزاد کشمیر ریڈیو میرپور کی 24ویں اور ایف ایم 101 میرپور کی 17ویں سالگرہ کی یہ تقریب ادارے کی نشریاتی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا ایک خوبصورت موقع ثابت ہوئی۔ اِس تقریب نے ریڈیو کی سماجی، ثقافتی اور عوامی اہمیت کو اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ اِس اُمید کو بھی تقویت دی کہ یہ ادارے آئندہ بھی عوام کی آواز بن کر امن، محبت، بھائی چارے، آگہی اور یکجہتی کا پیغام عام کرتے رہیں گے۔





ایف ایم 101 ملتان کی 16ویں سالگرہ

رپورٹ: عرفان ملک







یکم اکتوبر 2016ء ایف ایم 101 ریڈیو پاکستان ملتان کی سالگرہ کا دن ہے۔ یہ وہ دن ہے جب ایف ایم 101 ملتان نے اپنے نشریاتی سفر کا آغاز کیا۔ یہ چینل اپنی طرزِ نشریات کے اعتبار سے نوجوان نسل کا پسندیدہ ہے جسے فیملی چینل کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔ اِس چینل سے تعلق رکھنے والے تمام (DJ,s) میزبان بہت مہذب، تعلیم یافتہ اور گفتگو کے فن سے آشنا ہیں۔ ایف ایم 101 ملتان کے میزبان اپنے مداحوں سے لائیو ٹیلی کالز کے ذریعے براہِ راست بات چیت کرتے ہیں اور اُن کے سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ پروگرام میں مدعو فنکاروں، کھلاڑیوں، شوبز، ٹریفک پولیس افسران، ماہرِ تعلیم الغرض ہر طبقہ فکر سے تعلق رکھنے والی شخصیات سے سامعین کی جانب سے سوالات پوچھے جاتے ہیں۔

مہمان شخصیات نوجوانوں کو اپنے مقاصد میں کامیابی اور طرزِ عمل کو بہتر بنانے کے لئے اپنے تجربات سے مفید معلومات مہیا کرتے ہیں۔ اہم عالمی، قومی و علاقائی دنوں، تہواروں کی اہمیت اور افادیت سے نوجوانوں کا خاطر خواہ معلومات دی جاتی ہیں۔ اپنے انداز اور پیشکش کی وجہ سے ایف ایم 101 ملتان چینل سننے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اِس چینل کی مقبولیت میں نوجوان لیسنرز کا بہت کلیدی کردار ہے جو لائیو کالز کے ذریعے مختلف پروگراموں میں حصہ لیتے ہیں۔ اُن کی مختصر، مہذب اور مفید گفتگو سے دوسرے سننے والوں کو دعوتِ فکر کا موقع فراہم کرتا ہے۔ ایف ایم 101، ریڈیو پاکستان کا نیٹ ورک، وطنِ عزیز کے نوجوانوں کو تفریح کے ساتھ ساتھ موسیقی، مفید معلومات کے ذریعے کارآمد شہری بنانے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ ایف ایم 101 ملتان ریڈیو پاکستان ملتان کے احاطے میں ہے۔ اِس کے ساتھ ہی کمیونٹی براڈکاسٹ ایف ایم 93 بھی بطریقِ احسن اپنی نشریات پیش کر رہا ہے۔ ریڈیو پاکستان ملتان کے تین چینلز ایف ایم 101، ایف ایم 93 اور میڈیم ویوز 1035 کلوہرٹز ، اسٹیشن ڈائریکٹر جناب جعفر بلوچ صاحب کی سربراہی میں کام کر رہے ہیں۔

ایف ایم 101 ریڈیو پاکستان ملتان کے چینلز کے پروگرام پروڈیوسرز سٹاف، انجینئرز اور دیگر کارکنان کی جملہ کاوشوں سے نشریاتی سفر کامیابی سے جاری رکھے ہوئے ہے۔ ایف ایم 101، ریڈیو پاکستان ملتان کا قیام جن مقاصد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے عمل میں لایا گیا الحمدُ اللہ وہ خاطر خواہ حد تک پورے ہو رہے ہیں۔ ایف ایم 101 کی نشریات صبح 7-00 بجے سے رات 7-00 بجے تک دستیاب ہیں۔ جبکہ رات 7-00 بجے کے بعد کی نشریات ایف ایم 101 نیٹ ورک اسلام آباد سے پیش کی جاتی ہیں۔ ایف ایم 101 ملتان کے پروگرام سرائیکی، اُردو اور پنجابی زبان میں پیش کئے جاتے ہیں جن میں مقامی موضوعات، تہذیب، ثقافت، طب، ٹریفک، معاشرتی اقدار، اتحاد و اتفاق، شدت پسندی سے گریز، سماجی معاشرتی خامیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے تاکہ نوجوان نسل کی بہتر راہنمائی کی جا سکے۔

ایف ایم 101 ملتان کی موجودہ ٹیم عرفان ملک انچارج ایف ایم 101 ملتان اور اسٹیشن ڈائریکٹر جعفر بلوچ پر مشتمل ہے۔ ایف ایم 101 ملتان کے سامعین ٹیلی فون کالز کے علاوہ پیغام کے لئے SMS سروس کے ذریعے رابطہ کرتے ہیں جس کے لئے نمبر 4471 جبکہ بیرونِ ملک سامعین ایف ایم 101 ملتان کی نشریات اسٹریمنگ کے انٹرنیٹ کے توسط سے بھی سن سکتے ہیں۔

سالگرہ کی تقریب میں ایف ایم 101 ملتان کی پوری ٹیم اور تمام RJ,s نے بھرپور شرکت کی۔ سالگرہ کیک کٹنگ کی تقریب سیمینار ہال ریڈیو پاکستان ملتان میں منعقدہ ہوئی۔ تقریب کے مہمان خصوصی سابق ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان خورشید احمد ملک تھے۔ اِس خصوصی تقریب میں سابق ڈائریکٹر پروگرامز جناب منظور کامران، سابق اسٹیشن ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان ملتان جناب ریاض میلسی، خالدہ اقبال اور آصف گھمن بھی شریک ہوئے۔ تقریب کے میزبان انچارج ایف ایم 101 عرفان ملک اور اسٹیشن ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان ملتان جناب غلام عباس تھے۔ تقریب سے مختلف شرکاء نے خطاب کیا۔ مہمانِ خصوصی جناب خورشید احمد ملک نے ایف ایم 101 کے لہر بر زکو خصوصی مبارک باد دی اور کہا کہ نوجوان نسل کی تعلیم و تربیت اور انٹرٹینمنٹ کے حوالے سے ایف ایم 101 ملتان کا کلیدی کردار ہے۔

تقریب کے آخر میں اسٹیشن ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان ملتان جناب غلام عباس نے تمام شرکاء کا خصوصی شکریہ ادا کیا۔

Streaming Address : www.fm101multan2myradio.com

جبکہ فیس بک ایڈریس درج ذیل ہے:

www.fb.com/fm101channelpakistan

ریڈیو پاکستان لاڑکانہ..... سفر کہانی
31 ویں سالگرہ

تحریر: وسند علی مہر



ریڈیو پاکستان لاڑکانہ کا آغاز 24 ستمبر 1995ء کو ہوا، جب یہ اعلان ہوا کہ یہ ریڈیو پاکستان لاڑکانہ ہے۔اِس سے قبل ہی اِس علاقے کے لوگوں میں یہ خبر اتنی پھیل چکی تھی کہ 24 ستمبر کو ریڈیو پاکستان لاڑکانہ کے نشریاتی سفر کا آغاز ہوگا۔اُنہوں نے پہلے سے ہی ریڈیو سیٹ خرید کر اپنے گھروں، دوکانوں اور کام کی جگہوں پر رکھ لئے تھے۔اِس علاقے میں پہلے ریڈیو پاکستان خیرپور کی نشریات سنی جاتی تھیں۔ابتداء موجودہ براڈکاسٹنگ ہاؤس کے اندر دو کمروں کی عارضی عمارت میں ہوئی جہاں سے ایف ایم ۱۰۱ میگا ہرٹز کی فریکوئنسی پر آغاز ہوا، اور ریڈیو پاکستان لاڑکانہ نے بہت جلد اپنے سامعین کا ایک وسیع حلقہ پیدا کر لیا، اور آئے دن لوگ اپنے اِس قومی ادارے کی عمارت اور اسٹاف کو دیکھنے آنے لگے، ریڈیو پاکستان لاڑکانہ کا افتتاح اُس وقت کی وزیراعظم محترمہ بینظیر بھٹو نے کیا اور ساتھ میں ہی نئی تین منزلہ عمارت کا سنگِ بنیاد بھی رکھا۔ پہلی آواز معروف براڈکاسٹر محمد نقی کی نشر ہوئی اور پہلے اسٹیشن ڈائریکٹر جناب امداد علی خواجہ مقرر ہوئے جن کی نگرانی میں تعلیم و تربیت، معلومات اور تفریح کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پروگرام ترتیب دیئے گئے۔

ابتداء میں نشریاتی سفر کا آغاز ایک چھوٹی سی عمارت سے ایک کلوواٹ کے ٹرانسمیٹر سے کیا گیا اور نشریات صبح ۸ بجکر ۰ منٹ سے سہ پہر ۳ بجکر ۵۱ منٹ تک جاری رہتیں، بعدازاں 26 ستمبر 2006ء میں لاڑکانہ سکھر روڈ پر چوہڑ پور کے مقام پر دس کلوواٹ میڈیم ویو ٹرانسمیٹر کی تنصیب سے اوقاتِ نشریات میں تبدیلی ہوئی اور نشریات کا دورانیہ 18 گھنٹے کیا گیا، جس کے بعد نشریات صبح ۵ بجکر ۴۵ منٹ سے رات ۱۲ بجکر ۱۰ منٹ تک جاری رکھی جانے لگیں، جس سے نشریاتی دائرہ میں وسعت پیدا ہوئی۔ بلوچستان اور پنجاب کے سامعین تک ریڈیو پاکستان لاڑکانہ کی آواز کی رسائی ممکن ہوئی۔ اسٹوڈیو اور تمام دفاتر کو جدید سہولتوں سے آراستہ نئی عمارت میں منتقل کیا گیا۔ یکم جولائی ۲۰۰۸ء کو مقامی خبروں کا سلسلہ جاری ہوا جس میں سندھی خبروں کا ۵ منٹ دورانیے پر مشتمل نیوز بلیٹن شامل ہے۔اِس نیوز بلیٹن کی بدولت علاقے کے لوگ اپنے اِرد گرد رونما ہونے والے خبروں سے باخبر رہتے ہیں جس کا افتتاح ۱۶ اکتوبر ۲۰۱۷ء کو اُس وقت کے ڈائریکٹر جنرل مرتضیٰ سولنگی نے کیا۔ آج لاڑکانہ کی آواز میڈیم ویو ز ۱۰۵۳ کلوہرٹز پر پورے سندھ، پنجاب اور بلوچستان کے سامعین کے لئے میسر ہے۔

ریڈیو پاکستان لاڑکانہ کی نشریات کو سامعین میں مقبول کرنے میں تمام اسٹیشن ڈائریکٹروں خواجہ امداد علی، ضمیر علی بدایونی، زاہد حسین قلیانی، اقبال شاہ، حفیظ قریشی، ریاض احمد منہاس، جہانگیر احمد قریشی، اختر مرزا، علی نواز خاصخیلی، جہانگیر قریشی، محمد علی بابہ خان، غلام قاسم کوثر برڑہ، گل حسن قریشی، شوکت علی خاصخیلی، مختیار ملک، خلیل اللہ کاپھنو، علی مراد نانوری اور موجودہ اسٹیشن ڈائریکٹر سید عابد کاظمی کی اہم خدمات ہیں۔ اگر ریڈیو پاکستان لاڑکانہ کے پروگراموں کا جائزہ لیا جائے تو اِس وقت سامعین کے لئے تعلیمی، تفریحی، سماجی شعور، مذہبی، ادبی، تہذیبی، تاریخی، ثقافتی، سائنسی، نفسیاتی اور اخلاقی اقدار کی تعمیر کے لئے متعدد پروگرام پیش کئے جارہے ہیں اِن میں سے چند کا تعارف قارئین کی معلومات کے لئے کروانا بہت ضروری سمجھتا ہوں۔

جب ۲۰۱۰ء میں پورے سندھ میں سیلاب نے تباہی مچائی تھی اور لوگ خوف و ہراس کا شکار تھے اُس وقت ریڈیو پاکستان لاڑکانہ واحد نشریاتی ادارہ تھا، جس نے عوام کو حقیقی معلومات فراہم کیں۔ ضلعی انتظامیہ کے ساتھ مل کر ریڈیو پاکستان لاڑکانہ میں ایک سیل قائم کیا گیا اور نشریات کا دائرہ بڑھا کر ۲۲ گھنٹے کر دیا گیا اور علاقے میں جہاں تک کسی اور کی رسائی ممکن نہ تھی وہاں ریڈیو پاکستان لاڑکانہ اُن کے ہمراہ رہا اور عوام کی رہنمائی کے فرائض انجام دیئے۔ یاد رہے کہ تھوڑی بند کے شگاف کی پہلے پہل خبر ریڈیو پاکستان لاڑکانہ نے نشر کی تھی، اِس کے آدھے گھنٹے کے بعد دوسری نشریاتی اداروں نے یہ خبر نشر کی۔اُس کے بعد ۲۰۱۱ء کی بارشوں نے جب تباہی مچائی تو ایک بار پھر ریڈیو پاکستان لاڑکانہ کے کارکنوں نے اپنے فرائض بھرپور طریقے سے سرانجام دیئے۔ قومی، صوبائی اور بلدیاتی انتخابات ہوں یا برسیاں، سرکاری تقریبات ہوں یا عوامی اجتماعات، حکومتی اقدامات ہوں یا وطنِ عزیز کی نظریاتی فکر کی ترویج ہو، موجودہ حکومتی اقدامات اور فلاحی اور رفاہی پروگرام، ریڈیو پاکستان لاڑکانہ نے اپنے فرائضِ منصبی ہمیشہ صحیح اور مثبت انداز میں نبھائے ہیں۔

اب جو پروگرام نشر کئے جارہے ہیں اُن میں رویوں کی سائنس پر مشتمل پروگرام جن میں ایک ذمہ دار شہری اور وطن سے محبت کے ساتھ اچھا انسان بننے کے لئے فکری اساس اور تحریک فراہم کی جاتی ہے۔ پروگرام رابطہ، عوام جو آواز میں دیگر محکموں کے ضلعی افسران شرکت کرتے رہتے ہیں۔

مقامی زبان و ادب کے حوالے سے ادبی رہنمائی اور تربیت کے لئے ادبی پروگرام میں ادب اور زبان کے ساتھ تخلیقی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کے کئی اہم سلسلے شامل ہیں، صحتِ عامہ کی معلومات کے حوالے سے کورونا سے لے کر آج تک صحت کے معاملے میں رہنمائی فراہم کرنے کے لیے ریڈیو پاکستان لاڑکانہ خصوصی پروگرام ترتیب دے کر پیش کرتا رہتا ہے جن میں لاڑکانہ اور دیگر اضلاع کے ماہرین، ڈاکٹروں، سماجی خدمتگاروں اور دیگر کے انٹرویو، پروموز، اطلاعات و اعلانات نشر کئے اور عوام الناس کو آگاہی فراہم کی جاتی ہے۔اِن میں قابلِ ذکر ''ریڈیو کلینک'' پروگرام ہے جن کے علاوہ بہت سے سلسلے پیش کئے جاتے ہیں۔اِن کے ساتھ ساتھ خصوصی سامعین کے لئے پروگرام اور تعلیمی پروگرام نشر کئے جارہے ہیں۔

براڈکاسٹنگ ہاؤس ریڈیو پاکستان لاڑکانہ میں ''ذات دھنی گیلری (Artist Gallery)'' کے نام سے اسٹوڈیو سے ملحقہ دیواروں پر یہاں کے فنکاروں، قلمکاروں اور مشاہیر کی تصاویر آویزاں کی گئی ہیں جس کی بنیاد محترم غلام قاسم برڑو نے رکھی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ اِن میں سے کئی کے اہم انٹرویو ریڈیو پاکستان کی ویب سائٹ پر بھی رکھے جاچکے ہیں۔ اپنے سامعین سے رابطے کے لئے ریڈیو پاکستان لاڑکانہ سوشل میڈیا فیس بک پر بھی ایک پیج کی صورت میں میسر ہے، جہاں تمام تر نشریاتی سرگرمیوں کو اپنے سامعین کے ساتھ شیئر کیا جاتا ہے اور ریڈیو پاکستان کے مرکزی فیس بک پیج پر سندھ رنگ کے نام سے ایک ہفتہ وار پروگرام پیش کیا جاتا ہے جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے وابستہ افراد کو بطور مہمان مدعو کیا جاتا ہے۔ دیگر پروگراموں میں اور خصوصی پروگراموں کو تشکیل دے کر فتنہ الخوارج، مذہبی ہم آہنگی، سماجی علوم، بچوں، عورتوں اور عوام الناس کے حقوق کی آگاہی فراہم کی جاتی ہے اور وطنِ عزیز پاکستان کی محبت، اِس کے مشاہیر کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے اور قومی معاشرے کی تشکیل کے فکری بنیاد سے آگاہی اور ترغیب کے ساتھ قومی سورماؤں اور افواجِ پاکستان کے کردار کو اُجاگر کیا جاتا ہے۔ موجودہ ڈائریکٹر جنرل جناب سعید احمد شیخ کے وژن کے تحت ریڈیو پاکستان کو نئی جہتیں فراہم کرنے اور اِس کو علمی، ادبی، تعلیمی اور ثقافتی سرگرمیوں کی بھی بنیاد رکھی گئی ہے جس کی بناء پر تعلیمی، ثقافتی، علمی اور ادبی اداروں کے ساتھ رابطے قائم کر کے ریڈیو پاکستان کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔

ایف ایم 101 کی 28ویں سالگرہ کی تقریب پر مبنی رپورٹ

رپورٹ: ناصر علی خان





ریڈیو پاکستان کے مقبول نشریاتی ادارے ایف ایم 101 کے 28 برس مکمل ہونے پر ایک خوبصورت اور پُروقار تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ تقریب کا انعقاد کنٹرولر محترمہ عطیہ عامر اور پروگرام پروڈکشن منیجر محترمہ صدف رانی کی زیرِ نگرانی کیا گیا جس میں ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان جناب سید احمد شیخ نے خصوصی شرکت کی۔

ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان سید احمد شیخ نے ایف ایم 101 کی ٹیم اور تمام آرجیز کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ایف ایم 101 نے ریڈیو پاکستان کے روشن اور جدید چہرے کو دنیا بھر میں متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ ایف ایم 101 نے ہمیشہ سامعین کی توقعات پر پورا اترنے اور اُن کی پسند و ترجیحات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے نشریاتی اہداف کے حصول کے لیے بھرپور کردار ادا کیا اور بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ سامعین کی ضروریات کے مطابق اپنے پروگراموں کو ترتیب دیا، سامعین کو مقبول آرجیز متعارف کروائے، نہ صرف اپنی منفرد شناخت برقرار رکھی بلکہ نوجوان نسل کو معیاری تعلیم، صحت مند تفریح اور مفید معلومات فراہم کرنے میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان نے اِس موقع پر ادارے کے مستقبل کے منصوبوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ریڈیو پاکستان میوزک متعارف کرانے کا ارادہ رکھتا ہے، جبکہ جلد ہی ریڈیو پاکستان کے پلیٹ فارم سے نیوز چینلز کا اجراء بھی کیا جائے گا۔ اِن اقدامات کا مقصد سامعین کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ نشریاتی سہولیات فراہم کرنا اور ریڈیو پاکستان کے دائرہ اثر کو مزید وسعت دینا ہے۔ اُنہوں نے ایف ایم 101 کی ٹیم کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے اُس کے روشن مستقبل کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا اور اُمید ظاہر کی کہ ایف ایم 101 آئندہ بھی اپنے معیار، انفرادیت اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کے ذریعے سامعین کے دلوں میں اپنی جگہ برقرار رکھے گا۔

ڈپٹی کنٹرولر ایف ایم 101 محترمہ عطیہ عامر نے اِس موقع پر ایف ایم 101 کے 28 سالہ کامیاب سفر پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے ٹیم اور تمام آرجیز کو دلی مبارکباد پیش کی۔ اُنہوں نے کہا کہ ایف ایم 101 کا یہ 28 سالہ سفر دراصل ریڈیو پاکستان کے ساتھ اُن کی اپنی طویل وابستگی اور رفاقت کی یادوں سے بھی جڑا ہوا ہے، جو اُن کے لیے باعثِ فخر اور مسرت ہے۔ اُنہوں نے نوجوان نسل پر اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ نوجوان پاکستان کا روشن مستقبل اور ہماری سب سے بڑی اُمید ہیں۔ اُن کی صلاحیتیں، تخلیقی سوچ اور مثبت توانائیاں نہ صرف ملک کی ترقی بلکہ قومی اداروں کی مضبوطی اور بہتری میں بھی اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ ضرورت اِس امر کی ہے کہ نوجوانوں کو آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کیے جائیں تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ملک و قوم کی خدمت کر سکیں۔

اس موقع پر پروگرام پروڈکشن منیجر محترمہ صدف رانی نے کہا کہ ایف ایم 101 کے 28 سال مکمل ہونا پوری ٹیم کے لیے باعثِ مسرت اور اعزاز ہے۔ اُنہوں نے ایف ایم 101 کی کامیابی میں کردار ادا کرنے والے تمام ساتھیوں کی خدمات کو اہم قرار دیتے ہوئے اِس اُمید کا اظہار کیا کہ ٹیم اِسی جذبے اور محنت کے ساتھ ادارے کی ترقی اور نیک نامی کے لیے کام کرتی رہے گی۔ ایف ایم 101 کے 28 سالہ سفر کی یہ تقریب نہ صرف ماضی کی کامیابیوں کو یاد کرنے کا موقع تھی بلکہ مستقبل میں معیاری نشریات، ٹیم ورک اور عوامی خدمت کے عزم کو مزید مضبوط بنانے کی علامت بھی تھی۔

ایف ایم 101 کی ٹیم بشمول راقم الحروف نے اسٹوڈیو کی تزئین و آرائش میں خاص دلچسپی لیتے ہوئے اُسے اپنے آرجیز، سامعین و حاضرین کے لئے سجایا۔ تقریب کے اختتام پر سالگرہ کا ایک کیک کاٹ کر اس یادگار موقع پر خوشی، مسرت اور باہمی یکجہتی کے جذبات کا اظہار کیا گیا۔ تقریب کی رونق میں سینئر آرجیز نے بھی بھرپور اضافہ کیا، جنہوں نے اپنی دل نشیں آوازوں، منفرد اندازِ گفتگو اور دلچسپ پیش کش کے ذریعے لائیو پروگرامز میں سامعین کو محظوظ کیا اور حاضرین سے خوب داد سمیٹی۔ اُن کی شاندار پیش کش نے ایف ایم 101 کی مقبولیت، پیشہ ورانہ مہارت اور سامعین کے ساتھ مضبوط تعلق کی ایک خوب صورت عکاسی کی۔





سُروں میں روح پھونکنے والی سنگیت کارہ

عابدہ پروین

تحریر: ڈاکٹر احسان دانش

ساری فطرت موسیقی کے حُسن، ساز اور سنگیت کے جادو سے معمور ہے۔ آبشاروں سے گرتے ہوئے پانی میں ایک جداگانہ موسیقی ہے، دھیرے دھیرے چلتی ہوئی ہواؤں اور چھو کر گزرنے والی بادِ نسیم میں اپنا ایک سُر اور ساز ہے، پہاڑوں کی بازگشت میں الگ غناء اور ترنم ہے، پرندوں کی بولیوں میں انوکھے اور مدھر راگ ہیں۔۔۔ گویا یہ پوری کائنات موسیقی کے سحر میں ڈوبی ہوئی ہے، بس ہمارے پاس وہ سماعتیں ہونی چاہئیں جو ان سُروں سے سرور حاصل کر سکیں۔ میں سوچتا ہوں کہ اِس کائنات میں وہ کون سی روح ہو گی جو موسیقی کے جادو سے متاثر نہ ہوئی ہو۔۔۔ کسی نے کیا خوب کہا تھا:

"موسیقی فرشتوں کی زبان ہے، یہ معصوم دلوں کی آواز ہے۔"

اِس میں سچ ہے، سوز ہے، سکون ہے۔"

کوئی موسیقی کی رمز کو سمجھ کر ذرا ستار اور ترنم کو چھیڑ کر تو دیکھے، اِس میں اپنی ایک الگ تازگی اور توانائی ہے۔ یہی راگ ہے جو رقص کی کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ یہی سُر اور ساز ہیں جو روح کی کدورت اور میل کو دھو کر باطن کو اُجلا کر دیتے ہیں۔ کسی راگ کی روح سے نکلی ہوئی صدا، حقیقت یہ ہے کہ کئی بنجر دلوں کو سیراب کر دیتی ہے۔ جو شخص ساز کے سوز کا سرور پا لیتا ہے، اُس کا باطن گلستان بن جاتا ہے۔

موسیقی کی دنیا میں عابدہ پروین سندھ کی ایک ایسی جیتی اور سُریلی آواز ہیں جو سندھ کے جنگلوں اور ویرانوں سے اُٹھ کر آج پوری دنیا کے کانوں میں رس گھول رہی ہے۔ یہ وہ آواز ہے جس کی صدا میں ایک سرور ہے، جس کی لے میں ایک سوز ہے، جس کے ترنم میں آبشاروں جیسا آہنگ ہے اور جس کی مسکراہٹ میں مٹھاس ہے۔ روح کی گہرائیوں سے اُبھرنے والی یہ آواز آج کروڑوں دلوں کی دھڑکن بن چکی ہے۔ عابدہ پروین کی تاریخِ پیدائش 20 فروری 1954ء ہے۔ اُن کی پیدائش لاڑکانہ، سندھ میں ہوئی تھی۔

عابدہ آج بھی جب سندھ کے سُروں اور سازوں سے رچی بسی موسیقی میں اپنی آواز کی مٹھاس گھولتی ہیں تو صحرا میں بھٹکتے ہوئے پیاسے ہرن کا دل بھی ابرباراں کے احساس سے لبریز ہو کر رقص کرنے لگتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ شیخ ایاز کی یہ سطریں گنگنائی جائیں:

آؤ آؤ!

ناچو ناچو!

تمام کائنات رقصِ جام میں رچ گئی

سرود و ساز کی صدا کلام میں رچ گئی

حیاتِ مختصر خیالِ خام میں رچ گئی

شباب کی عظیم انتقام میں رچ گئی

آؤ آؤ!

ناچو ناچو!

اُن کی گائیکی میں وہ قوت ہے جو دل میں جلال اور مستی کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ یہ کیفیت چلّہ سرمست کے اِس شعر جیسی ہے:

"جس دم پیتا عشق دا جام، ساول مست و مست مدام"

اُن کے سرمستانہ انداز گائیکی میں شیخ ایاز کی یہ سطریں بھی سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں:

جس وقت ہماری تند چپے اور ساز نچ کر آواز جھپے

اُس وقت بلا شک کوئی گردن کاٹے، جو آیا، گایا ہے پیارا۔



راگ کی رانی عابدہ پروین کی آواز میں جو حُسن اور جمال ہے، وہ بے مثال ہے۔ اُن کے سُروں میں جو سوز ہے، وہ باطن کی پوری فضا کو گیروے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ عابدہ پروین کی سحر انگیز آواز ایک زوالی کیف و جلال کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ اُن کی صدائیں سوئے ہوئے دلوں میں ہلچل پیدا کر دیتی ہیں۔ وہ فنِ موسیقی کی ایسی دیوی ہیں جس کے سامنے سیکڑوں سُر سر بسجود ہیں۔

بچپن ہی سے میری والدہ بتایا کرتی تھیں کہ "عابدہ پروین ہمارے محلے میں رہا کرتی تھی۔ بچپن ہی سے اُسے گانے کا بہت شوق تھا اور وہ اپنی والدہ کے ساتھ گایا کرتی تھی۔۔۔ کبھی کبھی میرے پاس کپڑے سلوانے کے لیے بھی آیا کرتی تھی۔ اُن دنوں وہ ابھی لڑکی ہی تھی۔۔۔ بچپن ہی سے اُس کا جسم بھاری تھا اور اُن دنوں اسے بہت فکر رہتی تھی کہ کسی طرح وہ بھی دوسری لڑکیوں کی طرح سلم اور خوب صورت نظر آئے۔ اِسی لیے وہ اکثر ماموں عبدالرحمن عرف غازی مرد سے، جو میری دادی کا کزن تھا، اور تھوڑا بہت حکمت کا کام بھی کرتا تھا اور ہمارے ساتھ ہی رہتا تھا، کہا کرتی تھی:

"ماموں! مجھے کوئی ایسی دوا دو کہ میں دبلی ہو جاؤں۔"

یہی عابدہ پروین آگے چل کر راگ کی رانی اور امِ کلثوم بن گئیں اور سندھی موسیقی نے اُن کے فن کی غیر معمولی عظمت کا دل کھول کر استقبال کیا۔

آج بھی دنیا بھر میں عظیم گویوں نے اُنہیں بے پناہ عزت اور مرتبہ دیا ہے۔ بے شمار اُستاد گلوکاروں نے کئی مرتبہ اُنہیں جھک کر سلام پیش کیا ہے۔ براہِ راست پروگراموں اور کنسرٹس میں ایسے کئی یادگار مناظر دیکھنے کو ملے ہیں۔

عابدہ پروین وہ گلوکارہ ہیں کہ اُنہوں نے جہاں، جب اور جو بھی کلام گایا، وہ مقبول ہو گیا۔ شاعری کا اُن کا انتخاب عمدہ اور دُھن نہایت سُریلی ہوتی ہے۔ اُنہوں نے زیادہ تر صوفی بزرگوں کا کلام گایا ہے اور اُن میں سب سے زیادہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کو گایا ہے۔ شاہ کے تیسوں سُروں کو خالص روایتی راگنیوں میں گا کر اُنہوں نے شاہ لطیف سے اپنی محبت اور عقیدت کی ایک عملی مثال قائم کی ہے۔

محترمہ عابدہ پروین کو اب تک سیکڑوں اعزازات اور ایوارڈز سے نوازا جا چکا ہے۔ اُنہیں ملک کا سب سے بڑا صدارتی اعزاز "پرائیڈ آف پرفارمنس" بھی مل چکا ہے۔ اِس کے علاوہ اُنہیں متعدد بین الاقوامی اعزازات اور ایوارڈز بھی حاصل ہوئے ہیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ فن کی اُس چوٹی، اُس ماؤنٹ ایورسٹ پر کھڑی ہیں جہاں دنیا بھر کے تمام اعزازات بھی اُن کے سامنے چھوٹے دکھائی دیتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ عابدہ پروین سُروں میں روح پھونکنے والی وہ سنگیت کارہ ہیں جسے یہ فن اور یہ مقام دنیا کے بہت ہی کم فنکاروں کے حصے میں آیا ہے۔

بشکریہ پی بی سی لاڑکانہ

بچوں کا آہنگ

بچوں کا ادب

تحریر: احسان علی دانش

دنیا بھر میں کتابوں، فلموں، خاکوں، ڈراموں اور دیگر اصناف میں ادب کا جو ذخیرہ موجود ہے اور اُن میں بتدریج اضافہ ہوتا بھی جا رہا ہے، ادب کے اِس پُر شکوہ برج خلیفہ کی بنیادوں میں گویا سونے کی اینٹیں ہیں جو بچوں کے کھیل کود سے وجود میں آتی رہیں اور دھیرے دھیرے اِس پر ادب کا تاج محل بلند ہوتا گیا خواہ وہ مغرب کے شیکسپیئر، کیڈ، شیلے یا ورڈزورتھ ہو یا مشرق کے خسرو، بھلے شاہ غلام فرید یا چلّہ سرمست۔ اِن بانی ادباء کی نگارشات کی پرتیں کھولتے جائیں تو آخری پرت پر معصوم بچوں کے بچپنے میں نانی اماں کے ساتھ کھیلے گئے اُن کھیلوں کے مکالمے اور اشعار نظروں کے سامنے ظہور پذیر ہوں گے جو اِن کھیلوں کا حصہ ہوتے تھے اور بچے گھروں میں بولتے، پڑھتے اور گاتے ہوئے کھیلا کرتے تھے۔

مشرق میں بالخصوص جنوبی ایشیا میں شعوری طور پر جب بچوں کو اسکول بھیجا کرتے تو بعض جگہوں پر اسکول کی اور زندگی کی پہلی کتاب گویا شاعری میں ہوتی جیسے:

الف سے انار، ب سے بکری

چوہا نکالا مار و لکڑی

پ سے پنکھات سے تختی

چھوٹوں پر تم نہ کرو سختی

ج سے جوتا چ سے چاقو

تھانیدار نے پکڑا ہے ڈاکو

گلگت بلتستان پہاڑوں میں گھرا علاقہ ہے اور یہاں سردی وقت پہ پڑتی ہے اور نومبر سے مارچ تک لوگ گھروں میں محبوس ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں سردیوں کی طویل راتیں گزارنے کے لئے لوگ کسی ایک گھر میں جمع ہو کر محفل سجاتے ہیں جن میں ماہر کہانی گو بھی کہانی سناتے ہیں اور نانی اماں بھی بچوں کو وہی کہانیاں جو دلچسپ اور مختصر بھی ہوتی ہیں وہ سناتی ہیں اور بچے پورے انہماک سے سنتے ہیں۔ اِن میں سے کسی ایک کہانی کا نمونہ پیش نہ کیا جائے تو تحریر کا حق ادا نہیں ہو سکے گا تو ایک دیسی کہانی ملاحظہ فرمائیں۔



ایک چڑیا اور لومڑی کی دوستی ہو گئی۔ ایک دن لومڑی نے چڑیا سے کہا: یار ایک عرصہ ہو گیا کہیں کھیل تماشہ نہیں دیکھا۔ تیرے ساتھ بیٹھ بیٹھ کر جی اُکتا گیا۔ کہیں سے کوئی کھیل تماشہ دکھاؤ۔

چڑیا نے کہا: ٹھیک ہے آج تم اِس اونچے مقام پر چھپ کر بیٹھی رہو اور سامنے والے کھیت میں تماشہ دیکھو۔ لومڑی متذکرہ مقام پر اپنے آپ کو چھپائے بیٹھی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد اِس کھیت کا مالک بہادر کسان ہل اور بیل کے ساتھ پہنچ گیا۔ اُس کا بھائی، بیٹے اور بیوی سب کھیت میں پہنچ گئے اور ہل چلانا شروع کر دیا۔ چڑیا بھُدکا کر سیدھا بیل کی سینگ پر بیٹھ گئی۔ جب سب کی نظر چڑیا پر پڑی تو چڑیا وہاں سے اُٹھ کے بچے کے سامنے اتر گئی۔ اور بچے نے پکڑنے کی کوشش کی تو وہاں سے اُٹھ کر کسان کے آگے اتر گئی۔ کسان نے ہاتھ میں اینٹ کا ٹکڑا لے لیا جیسے ہی مارنے کو تیار ہوا تو وہ کسان کے بھائی کے سر پر جا اتری۔ اتنے میں کسان نے پوری طاقت سے چڑیا پر اینٹ دے ماری۔ چڑیا لمحہ بھر میں اُڑ کر لومڑی کے پاس پہنچ گئی جبکہ اینٹ نے اپنا کام کر دیا۔ بھائی کا سر پھٹ گیا اور خون کے دھارے چھوٹنے لگے۔ بھائی نے ایک اور اینٹ اٹھا کے بڑے بھائی کی طرف مارا۔ جیسے ہی دونوں کی بیویوں نے یہ منظر دیکھا تو ہاتھوں میں پتھر اور اینٹیں اُٹھا کر ایک دوسرے پر حملے کرنے لگیں۔ یوں لمحہ بھر میں وہ کھیت میدانِ جنگ بن گیا۔ سب نے ایک دوسرے کے سر پھوڑے اور جب تک پولیس نہ پہنچی یہ گھمسان کی جنگ جاری رہی۔

لومڑی اور چڑیا دونوں ہنس ہنس کے بے حال ہو گئے۔ چڑیا نے لومڑی سے پوچھا: بولو کھیل کیسا رہا؟؟

ایک دن لومڑی نے کہا: "یار؛ بھوک لگی ہے مزے کا کھانا کھانا چاہتی ہوں۔ بندوبست کیا جائے۔"

"تم اِس غار کے نیچے چھپی رہو اور جیسے سامنے مزے کا کھانا نظر آئے تو فوراً اُٹھ اُٹھ کر غار میں لے جاؤ۔ پھر دونوں مل بانٹ کے کھائیں گے۔" چڑیا سے سمجھا دیا۔ ہوا یہ کہ اُس دن اُسی راہ سے ایک خاتون نے گزرنا تھا جو اپنے بچے کے ساتھ تھی۔ خاتون کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے گوشت سے بھری ٹوکری تھی۔ چڑیا بچے کے سامنے بھُدکنے لگی۔ بچے نے پہلے خود چڑیا پکڑنے کی کوشش کی، جب ہاتھ نہیں لگی تو ماں سے کہا کہ چڑیا پکڑے۔ خاتون ٹوکری زمین پہ رکھ کر چڑیا کے پیچھے بھاگی اور ٹوکری سے ذرا دُور نکل گئی تو لومڑی نے لمحوں میں ٹوکری اُٹھائی اور غار لے آئی۔ لمحوں میں چڑیا بھی پہنچ گئی اور دونوں نے مزے لے لے کر نچ اُڑایا۔

ایک دن لومڑی نے کہا: یہ سب ٹھیک مگر میں جانوروں میں سب سے چالاک ہوں، کسی کے ہاتھ آ نہیں سکتی اور اگر آؤں بھی تو چکما دے کر نکل آسکتی ہوں۔" چڑیا کو یہ بات تھوڑی بری سی لگی اور کہا! تم آج یہاں اِس کلورٹ کے اندر چھپ کے رہو میں اپنی کارروائی کرتی ہوں۔ یہ کہہ کر لومڑی کو سڑک پر بنی کلورٹ کے اندر چھپایا اور خود اسکول میں طلبا کو چھٹی ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ جیسے ہی بچے کلورٹ کے قریب پہنچے۔ چڑیا بچوں کے سامنے بھُدکنے لگی۔ بچوں نے پکڑنے کی کوشش کی تو اسی کلورٹ میں جا گھسی۔ لڑکوں نے کہا یہ کوئی بیمار چڑیا ہے آؤ مل کے پکڑتے ہیں۔ بچے دونوں طرف سے کلورٹ میں گھس گئے تو یہ چلا اندر ایک لومڑی بھی ہے۔ بچے چڑیا بھول گئے اور لومڑی پکڑ لی۔ لومڑی کے پاؤں میں رسی باندھ لی اور سڑکوں پر گھسیٹنے لگے۔ کسی نے پتھر مارا کسی نے لکڑی ماری اور بیچاری کو زخمی کر دیا۔ لومڑی دن بھر اذیت میں مبتلا رہی۔ شام کے وقت کسی بزرگ شہری کی نظر پڑی تو اُسے رحم آیا اور بچوں کو ڈانٹ پلا کر اُس کی رسیاں کھول دیں اور آزاد کرائی۔ لومڑی بے حال ہو کر چڑیا کے پاس پہنچی تو توبہ کرنے لگی۔ ہا ہا ہا۔ کبھی دوست کو چالاکی نہیں دکھاؤں گی۔

گلگت بلتستان میں اِس طرح کی سینکڑوں کہانیاں زبان زدِ عام ہیں۔ گویا بچوں کا ادب دنیائے ادب کی بنیاد ہے اور اِسی بنیاد پر دنیا کی آٹھ سو زبانوں کے ادب کا پُر شکوہ محل کھڑا ہے۔

بشکریہ پی بی سی گلگت